طلوعِ اسلام

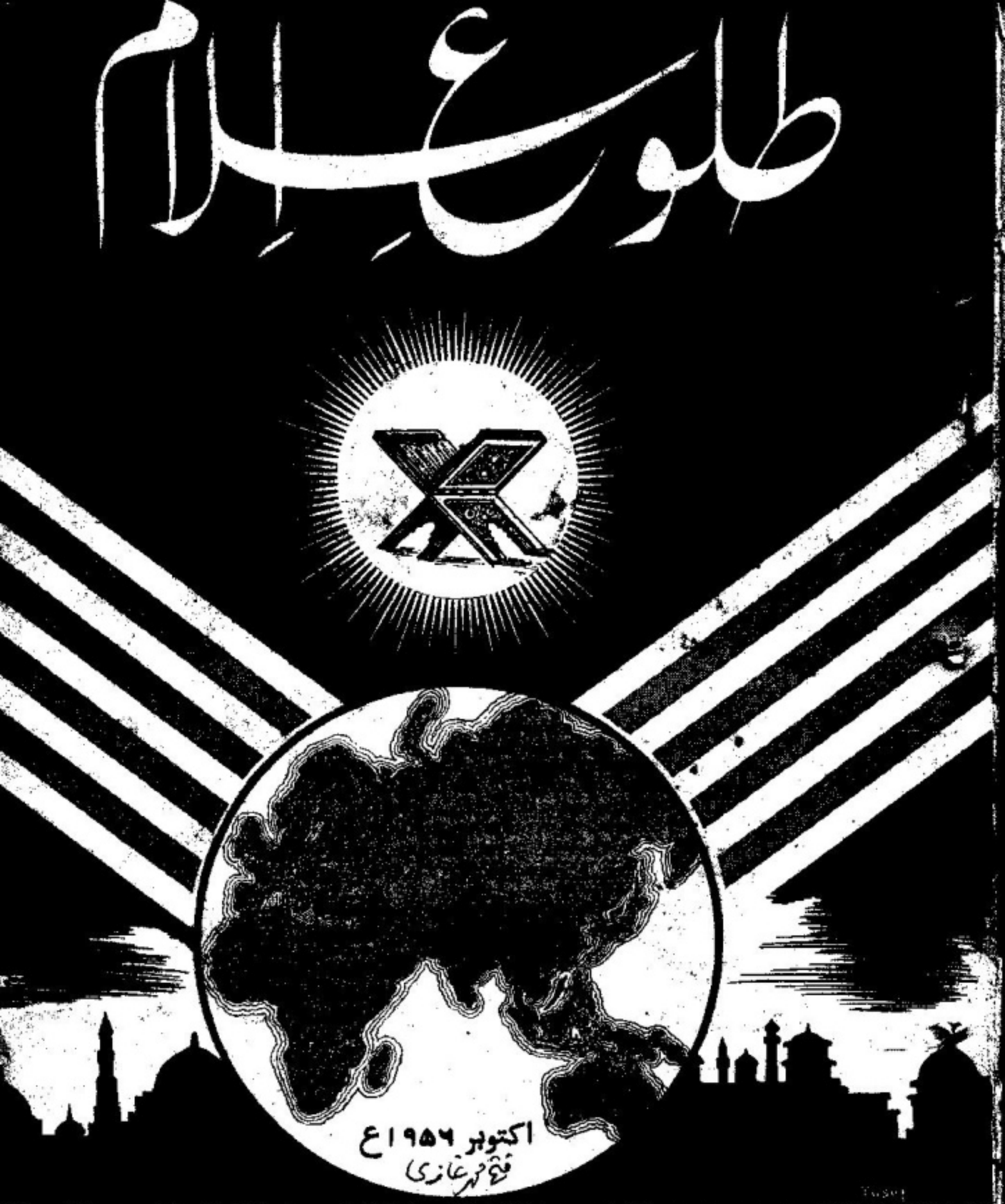

اکتوبر ۱۹۵۶ء
فتح مہر غازی

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

ہمارا مستقل پتہ
۳/۱۵۹۔ ایل
پی۔ای۔سی
ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی
نمبر ۲۹

بدلِ اشتراک
سالانہ
ہندوستان اور پاکستان سے
آٹھ روپے
غیر ممالک سے
۱۴ شلنگ

ٹیلی فون نمبر
۴۱۴۸۸

قیمت فی پرچہ ہندوستان اور پاکستان سے بارہ آنے

جلد ۹ | اکتوبر ۱۹۵۶ء | نمبر ۹

فہرست مضامین

لمعات	۲ — ۸
تکذیب دین کون کرتا ہے؟ اور مصلی کسے کہتے ہیں؟	۹ — ۲۴
طاہرہ کے نام (از محترم پرویز صاحب)	۲۷ — ۳۵
مجلس اقبال	۳۷ — ۴۲
ننگ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن	۴۵ — ۴۸
اطاعتِ رسولؐ	۴۹ — ۶۴
طلوعِ اسلام کنونشن	۶۷ —
اسلام کی سرگذشت	۶۸ — ۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

لمعات

۳۰ راگست کو جبکہ ستمبر کا طلوع اسلام حوالۂ ڈاک کیا جارہا تھا۔ محترم غلام محمد (سابق گورنر جنرل پاکستان) کی وفات کی اندوہ ناک خبر ملی۔ ان کی صحت ایک عرصے سے خراب چلی آرہی تھی۔ لیکن نہ ایسی کہ وہ ان کی موت کو اتنا قریب لے آتی۔ اس لئے یہ حادثہ المیہ غیر متوقع سا تھا۔ انھیں جب سپرد خاک کیا جارہا تھا تو ہمیں یہ خیال آرہا تھا کہ عزم و استقلال کا ایسا آہنی پیکر جس کی قوتِ بازو نے ابھی کل پوری کی پوری مملکتِ پاکستان کو موت کے منہ سے نکالا تھا۔ آج خود موت کے آغوش میں چلا گیا کیسی خوش آمد ہے وہ موت جو ایک قوم کو سامانِ زندگی عطا کرنے کے بعد آئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ہمارے اس قحط الرجال میں مرحوم کی ہستی مغتنمات میں تھی۔ وہ اس انداز کے انسانوں کی آخری یادگاروں میں سے تھے۔ جن کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے		تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے		چو جوئے در کنارِ کوہسارے

جنازہ پر خواجہ ناظم الدین اور چودھری محمد علی دونوں موجود تھے جنھیں دیکھ کر ہمارا یہ احساس بیدار تر ہو رہا تھا کہ آج پاکستان کو ایک بار پھر غلام محمد کے دستِ توانا کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ ملک کو پھر اس تباہی سے بچا سکے جس سے اس نے خواجہ صاحب کے زمانے میں نجات دلائی تھی۔

قارئین طلوع اسلام اس حقیقت سے واقف ہیں کہ طلوع اسلام کو نہ سیاسی پارٹیوں سے کوئی سروکار ہے۔ نہ افراد سے کچھ واسطہ۔ اس کا مقصد احیائے دین اور استحکام پاکستان ہے۔ اور جو پارٹی یا فرد دین اور پاکستان کی بنیادوں کو ضعف پہنچانے کا موجب بنے۔ اس سے ہمیں کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ بنا بریں ہمیں غلام محمد۔ ناظم الدین یا محمد علی میں سے کسی کی وزارت سے کچھ تعلق نہیں۔ ہم تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کس نے ان بلند مقاصد کے سلسلہ میں کیا کیا؟ ہمارے نزدیک ان مقاصد کو چودھری محمد علی صاحب

کے ہاتھوں جس قدر نقصان پہنچا ہے وہ اس سے کسی صورت بھی کم نہیں جو نقصان انھیں خواجہ صاحب کے ہاتھوں پہنچا تھا بلکہ ایک جہت سے یہ نقصان کچھ زیادہ ہی ہے۔ خواجہ صاحب کے زمانے میں ملک پر جو تباہی آئی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے قدامت پرست مذہبی عنصر (ملا) کو بہت زیادہ اہمیت دیدی۔ جس سے ان حضرات کی جرأتیں بیباک ہوگئیں۔ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ مذہبی پیشواؤں نے جب اور جہاں بھی حکمراں طبقہ کے ہاں بار پایا ہے، قوم پر تباہی آگئی ہے۔ چودھری صاحب نے بھی اپنے زمانے میں یہی کچھ کیا اور علاوہ دیگر شواہد کے اس کا بین ثبوت وہ دستور ہے جسے اسلامی کہہ کر مبارکبادیں لی گئیں۔ اور اسے چودھری صاحب کے عہد کا زریں کارنامہ قرار دیا گیا۔ جو لوگ اسلام کی حقیقت پر نگاہ رکھتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ اس دستور کو اسلامی کہنا اسلام کی تعلیم سے ناواقفیت کی دلیل ہے (چونکہ اس موضوع پر ہم پہلے شرح وبسط سے لکھ چکے ہیں اس لئے اس وقت ان امور کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں) یہ دستور اس حقیقت کی صاف غمازی کرتا ہے کہ اس سے مقصود صرف ملاؤں کے طبقہ کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ خواجہ صاحب کے زمانے میں ملاؤں کے ہاتھوں ملک پر جو تباہی آئی وہ وقتی اور ہنگامی تھی۔ لیکن اس نام نہاد اسلامی دستور کی رو سے ملک جن مصائب کا شکار ہونے والا ہے ان کے اثرات بہت دور رس اور ان کے مضرات بہت گہرے ہیں۔ ملک کے مستقبل کی بنیادیں یہ ایک ایسی ٹیڑھی اینٹ رکھ دی گئی ہے۔ جس پر اٹھنے والی عمارت تا ثریا ٹیڑھی چلی جائے گی۔ ملک کے تخریبی عنصر کے ہاتھ میں یہ ایک فلیتہ دیدیا گیا ہے جس سے وہ جب جی چاہے فتنہ و فساد کی آگ مشتعل کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ابھی سے اس کی تیاریوں میں مصروف ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ یہ ہے انتشار اور بدامنی کا وہ بیج جو چودھری صاحب کے ہاتھوں سے بویا گیا اور جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ اس کے مضر اثرات اس نقصان سے کہیں زیادہ اور گہرے ہیں جو خواجہ ناظم الدین صاحب کی ملا نوازی سے واقع ہوا۔

پھر خواجہ صاحب اور چودھری صاحب میں بڑا فرق یہ بھی ہے کہ خواجہ صاحب ملا کے مذہب کی صداقت کے دل سے قائل تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی اور اس کے معمولات اس پر شاہد ہیں اس لئے اگر وہ ملا کو آگے بڑھاتے تھے تو دین کی خدمت سمجھ کر ایسا کرتے تھے۔ لیکن چودھری صاحب کے متعلق تو یہ باور کرنا مشکل ہے کہ وہ ملا کو فی الحقیقت صحیح اسلام کا نمائندہ اور دین خداوندی کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ چودھری صاحب ذہین آدمی ہیں اور انھیں فکر اقبال سے گہری دلچسپی رہی ہے اور اس حقیقت سے کون بے خبر ہے کہ جو شخص فکر اقبال سے اس طرح متاثر رہا ہو۔ وہ ملا کو صحیح اسلام کا نمائندہ کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ نہ ہی وہ پاکستان کے موجودہ دستور کو اسلامی دستور کہہ سکتا ہے۔ اقبال اس ضمن میں ایسے واضح اور روشن نشانات راہ چھوڑ گیا ہے کہ جس ذہن کو اس سے کچھ بھی علاقہ ہو۔ وہ اس قسم کی غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہو سکتا کہ یہ دستور اسلامی خطوط پر تشکیل ہوا ہے۔ اس لئے چودھری صاحب کی ملا نوازی خدمتِ دین کے جذبہ کا نتیجہ نہیں۔ یہ ایک سیاسی مصلحت تھی لیکن ان کی اس سیاسی مصلحت کے لئے ملک کو کس قدر قیمت ادا کرنی پڑیگی اس کا اندازہ آنے والا مورخ ہی لگا سکے گا۔

اس کے بعد دوسرے نقطہ کی طرف آیئے۔ خواجہ صاحب کے مویدین کہا کرتے تھے (اور ہمیں خود اس کا اعتراف ہے) کہ خواجہ صاحب میں بڑی خوبیاں تھیں۔ ان میں بددیانتی CORRUPTION بالکل نہیں تھی۔ وہ متواضع، خلیق، منکسر المزاج تھے۔ فواحش سے مجتنب رہتے تھے۔ یہ خوبیاں آجکل بہت کم لوگوں میں ملتی ہیں۔ اس لئے اس جیسے انسان کے ہاتھوں سے قلمدانِ وزارت چھین لینا بہت زیادتی تھی۔ اب چودھری صاحب کے مویدین بھی یہی کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ خوبیاں بہت عمدہ ہیں۔ لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ خوبیاں سلبی (NEGATIVE VIRTUES) ہیں جو ایک زاہد گوشہ نشین کے لئے تو کافی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک ایسا شخص جس کے ہاتھ میں کسی مملکت کی زمام اقتدار دی جائے۔ اس میں ان سلبی خوبیوں کے علاوہ بہت سی ایجابی خوبیوں (POSITIVE VIRTUES) کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ قوموں کو جس قدر نقصان بددیانت ارباب اقتدار کے ہاتھوں پہنچا ہے۔ نااہل حکمرانوں کے ہاتھوں سے اس سے کم نقصان نہیں پہنچا۔ پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ہر کام کے لئے ایک جداگانہ اہلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص میز پر بیٹھ کر منشی گری کا کام نہایت خوش اسلوبی سے کر سکے۔ وہ امور مملکت کو بھی بہ حسن و خوبی سرانجام دے سکے۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (۴/۵۸) تو اس سے یہی مطلب تھا کہ جس کام کے لئے کسی کو منتخب کرو یہ دیکھو کہ اس میں اس کام کی اہلیت بھی ہے یا نہیں۔ ہماری قوم کی تباہی کا سبب یہ ہے کہ اس نے اہلیت کے متعلق اس بنیادی نقطہ کو نظر انداز کر دیا۔ اور محترم چودھری صاحب کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگا سکے کہ کون سا کام ان کی حد استطاعت و اہلیت سے باہر ہے۔ وہ جب تک ایسے امور کی سرانجام دہی پر متعین رہے۔ جن میں ذمہ داری براہِ راست ان پر نہیں آتی تھی اپنی ذات کے لئے کامیاب رہے۔ لیکن جونہی انھوں نے اس سے آگے بڑھ کر ان امور پر ہاتھ ڈالا جن کے فیصلوں کی ذمہ داری ان پر عاید ہوتی تھی بری طرح سے ناکام ہو گئے۔ اقبال کے الفاظ میں

مقامِ ہوش سے آساں گذر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

چودھری صاحب کی ناکامی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اتنا کچھ اپنے گرد سمیٹ لیا جس سے عہدہ برا ہونا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس پر پارٹی بازی کے جوڑ توڑ۔ نتیجہ یہ کہ وہ بڑے بڑے ضروری کاموں کی طرف بھی کما حقہٗ توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ پھر بدقسمتی یہ کہ اختیارات کی وسعت سے جو مجموعہ مشکلات سامنے آتا ہے (اور جس کا آنا ناگزیر ہے) اس کے مقابلہ کی چودھری صاحب میں ہمت نہ تھی (اس کا زندہ ثبوت ان کی سیاسی زندگی کا آخری حادثہ ہے۔ جس میں انھوں نے انہی مشکلات سے گھبرا کر اقتدار کی خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن چھڑا لیا)

یہ تھیں وہ ایجابی کمزوریاں جو چودھری صاحب کی ان سلبی خوبیوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں۔ جن کی طرف اوپر

اشارہ کیا جا چکا ہے۔ قرآن کی رو سے حسنات میں تو اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ بعض معمولی کمزوریوں (سیئات) کی مدافعت کر دیں۔ لیکن ایجابی جوہروں کے فقدان یا کمی کو سلبی خوبیاں کسی صورت میں بھی پورا نہیں کر سکتیں۔ قرآن نے اسی لئے اجیر کے لئے امین کے ساتھ قوی ہونے کی شرط بھی لاینفک قرار دی ہے (۲۸/۲۶)

اس مقام پر اس حقیقت کا ایک بار پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ ہماری یہ تنقید چودھری محمد علی صاحب کی ذات کے خلاف نہیں ہے۔ اگر ان کا تعلق ملک کے نفع یا نقصان سے نہ ہوتا تو ان صفحات میں ان کا ذکر تک بھی نہ آتا۔ اس تبیانِ حقیقت سے ہمارا مقصد قوم کو یہ بتانا ہے کہ ہماری تباہیوں کے اسباب و علل کیا ہیں تاکہ اگر ہو سکے تو ہم تلافی مافات کر سکیں۔ اور آئندہ ایسے امور سے محتاط رہیں۔

بہرحال ملک کی بساطِ سیاست پر پھر ایک تبدیلی نمودار ہو گئی ہے۔ ایک وزارت چلی گئی۔ اور اس کی جگہ دوسری وزارت قائم ہو گئی ہے۔ ہمیں نہ اُس کا غم ہے نہ اِس کی خوشی۔ اس لئے کہ جیسا کہ ہم شروع سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ملک کی نجات وزارتوں کی تبدیلی سے نہیں ہو سکتی۔ جب تک ملک میں سیاسی پارٹیاں موجود ہیں۔ اور جب تک مسلمانوں میں مذہبی فرقوں کا وجود ہے نہ قوم کو کامیابی اور کامرانی نصیب ہو سکتی ہے نہ اسلام کے پنپنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب تک ہم اس حقیقت پر ایمان نہیں لے آتے کہ ملتِ اسلامیہ غیر مسلموں کے مقابلے میں بجائے خویش ایک پارٹی ہے۔ اور اس کے اندر پارٹیوں اور فرقوں کا وجود افتراق کی ابلیسی لعنت اور قرآن کے الفاظ میں شرک۔ اس وقت تک فلاح و بہبود کی طرف ہمارا کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا۔ لیکن پارٹیوں کے مٹ جانے سے ہمارے سیاسی لیڈروں کی سیادت مٹ جاتی ہے۔ اور فرقوں کے ختم ہو جانے سے مذہبی راہ نماؤں کی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کی کوشش یہی رہتی ہے کہ نہ وہ بٹیں نہ یہ ختم ہوں۔ اس کے بعد یہ توقع رکھنا کہ قوم ابھرے گی اور اسلام زندہ ہو جائیگا خود فریبی نہیں تو ابلہ فریبی ضرور ہے۔ ایک دین اور ایک امت، یہ ہے اسلام کا اصل الاصول۔

اگر باایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

---

(۳)

ہندوستان کے مسلمانوں پر آجکل جو قیامت گذر رہی ہے کونسا قلب حساس ہے جو اس پر خون نشاں اور کون سی چشم اعتبار ہے جو اس پر اشکبار نہ ہو گی۔ ان کے گھر بار لوٹے جا رہے ہیں۔ انہیں پابند طوق و سلاسل کیا جا رہا ہے۔ انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب کس جرم کی پاداش میں؟ اس جرم کی پاداش میں کہ ان کے رسولؐ کی شانِ اقدس و اعظم میں اگر کوئی دریدہ دہن (پناہ بخدا) گستاخی کرتا ہے تو اس پر ان کی غیرت کیوں ابھر آتی ہے۔ اس قصور کی سزا یہ کہ ناموسِ رسالتؐ (فداہ

ابی دامی ہے کے تحفظ کے لئے ان کا دل خون کیوں ہوتا ہے؟ اور یہ سزائیں کس کی طرف سے دی جا رہی ہیں۔ اس حکومت کی طرف سے جس نے اقلیتوں کے جان۔ مال۔ عصمت۔ مذہب کے تحفظ کو اپنے دستور کا لازمی جزو قرار دے رکھا ہے؟ اس نہرو کی طرف سے جو دنیا میں اپنی وسعتِ ظرف اور کشادہ نگہی کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتا! لیکن ہمیں اس باب میں بھارت کی حکومت سے کچھ نہیں کہنا۔ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ انھیں قوت کے نشے میں اس کا ہوش ہی نہیں کہ انسانیت کسے کہتے ہیں۔ اور شرافت کس جنس کا نام ہے۔ ہمیں کچھ کہنا ہے تو خود حکومتِ پاکستان اور یہاں کے مسلمانوں سے۔ حکومت سے یہ کہ آپ نے تشکیل پاکستان کے وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ ہم تمہاری حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ کیا آپ کو اپنے وعدہ کا اتنا ہی پاس ہے؟ کیا آپ کو اس کا علم نہیں کہ وہاں کے مسلمان جب اُس ننگِ انسانیت کتاب کی بندش کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جس میں حضور نبی مرتبت کی شان میں گستاخی کی گئی ہے تو ان پر پاکستان کے حامی ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اور اسی الزام میں انہیں دھر لیا جاتا ہے۔ کیا آپ کو اتنا بھی احساس نہیں کہ جن مظلوموں کو آپ کے ساتھ نسبت دے کر موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ آپ کو ان کے ساتھ کس قدر تعلق رکھنا چاہیئے؟ ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ آپ ہندوستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں۔ لیکن کیا آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اقوامِ عالم کے مختلف اداروں میں بھارت کے اس شرمناک اور وحشیانہ مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں؟ کیا آپ دنیا کو یہ بھی نہیں بتلا سکتے کہ وہاں کی اقلیت کے ساتھ یہ کیا سلوک ہو رہا ہے؟

اور یہاں کے مسلمانوں سے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے دورِ غلامی میں آپ کی یہ حالت تھی کہ اگر سمرنا کے کسی یتیم کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا تو ہندوستان کے شہروں اور گاؤں میں آپ پر راتوں کی نیند حرام ہو جایا کرتی تھی۔ کیا اس کے بعد آزادی کا یہی اثر ہے کہ آپ کی دیوار کے سائے میں ہندوستان کے مسلمانوں پر اس قدر بے پناہ مظالم ہو رہے ہیں۔ اور آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی[1]۔ اگر آزادی کا یہی اثر ہے تو اس آزادی سے وہ غلامی ہزار درجے اچھی تھی۔ جس میں دلوں میں اسلام کی غیرت اور مظلوموں سے ہمدردی کے جذبات موجزن رہتے تھے۔ کیا آپ وہی نہیں جو اُس دورِ محکومی میں ناموسِ رسالتؐ کے تحفظ کے لئے اپنی جانیں تک قربان کر دیا کرتے تھے۔ اب آپ کی حمیت کو کیا ہو گیا؟ یا آپ نے سمجھ لیا ہے کہ ہندوستان میں جو گستاخی ہوئی ہے۔ وہ "وہاں کے مسلمانوں کے رسولؐ" کے خلاف ہوئی ہے۔ ہمارا اس سے کچھ واسطہ نہیں! یہ اُن کا "مقامی" مسئلہ ہے اگر آپ کا احساس واقعی حسی ہے کا یہی عالم ہے تو اس زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے جو دل ناموسِ رسالت کے تحفظ اور مظلوموں کی امداد کے لئے دھڑکتا نہیں اس کی حرکت جتنی جلدی بند ہو جائے اچھا ہے۔

---

[1] یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ ۱۶ر ستمبر کو پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں یوم احتجاج منایا گیا اور مکمل ہڑتال کی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کے مسلمان خوابِ خرگوش سے کچھ جاگے ہیں اور ان میں کچھ حرکت پیدا ہوئی ہے۔ خدا کرے یہ حرکت ہنڈیا کا ابال ثابت نہ ہو اور کچھ کام کر جائے۔

باقی رہے ہندوستان کے مسلمان۔ سو انھیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ انھوں نے اس بیکسی اور بے بسی کے عالم میں جس غیرت و حمیت اور زندگی و حرارت کا ثبوت دیا ہے اس سے انھوں نے دنیا کو بتا دیا ہے کہ

مر نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

اور ہم پر اس حقیقت کو آشکارا کر دیا ہے کہ

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

ہمیں یقین ہے کہ ان کا خونِ ناحق ضرور رنگ لا کر رہے گا

---

(۳)

عائلی کمیشن کی رپورٹ کے سلسلہ میں بالآخر احتشام الحق صاحب کا اختلافی نوٹ شائع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں اکثر احباب نے کہا ہے کہ ہمیں اس کے متعلق ضرور لکھنا چاہیئے۔ جہاں تک اس مسئلہ کی اہمیت کا تعلق ہے ہمارے ان احباب کی بیتابی قابلِ فہم ہے۔ لیکن انھیں غالباً اس کا علم نہیں کہ اس نوٹ میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کے متعلق ہم اس سے پہلے لکھ نہ چکے ہوں وہی غیر قرآنی صدائیں کہ نکاح سال بھر کی بچی کا بھی ہو سکتا ہے۔ مرد جتنی جی چاہے شادیاں کرے اور جب جی چاہے عورت کو طلاق دیدے۔ اس کے برعکس عورت کو حق طلاق نہیں دیا جا سکتا۔ یتیم پوتا اپنے دادا کی میراث سے محروم رکھا جائے گا اور آخر میں یہ کہ یہ شریعت کے معاملات ہیں جن میں ہمارے سوا کسی کو لب کشائی کا کوئی حق نہیں۔ قارئین طلوع اسلام جانتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کے متعلق ہم اس سے قبل تبا نہیں چکے کہ قرآن کریم کی رُو سے اصل پوزیشن کیا ہے۔ یہ تو رہا اس نوٹ کے مشمولات کے متعلق۔ جہاں تک اس کی علمی حیثیت کا تعلق ہے۔ اس کے لئے اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

البتہ ہمیں اس سے اتنی خوشی ضرور ہے کہ ان کی اس قسم کی حرکتوں سے دنیا کو اس کا پتہ چل جاتا ہے کہ یہ حضرات جو اپنے آپ کو علم دین کا واحد اجارہ دار بنائے بیٹھے ہیں، ان کا مبلغ علم کیا ہے۔ اور جس خود ساختہ مذہب کو یہ دنیا کے سامنے بے مثل و بے نظیر کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ اس کی عمارت کن "محکم" بنیادوں پر استوار ہے۔ کس قدر صحیح کہا ہے قرآن نے کہ مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت۔ جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں کو اپنا کارساز بنالیتے ہیں۔ ان کی مثال مکڑی کی طرح ہے۔ اتخذت بیتا۔ وہ ایک گھر بناتی ہے۔ اور اپنی دانست میں سمجھتی ہے

کہ اس نے بہت مضبوط گھر بنایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت دنیا کے سب گھروں میں کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔ لو کانوا یعلمون (۲۹/۴۱) اے کاش! وہ لوگ جو خدا کے دین کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ مذہب کو دین قیم سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت کو جان لیتے کہ ان کا یہ گھروندا کس قدر کمزور ہے۔

صغریٰ کی شادی کی تائید میں ان حضرات کی طرف سے صرف ایک دلیل پیش کی جاتی ہے (اور یہی دلیل احتشام صاحب نے بھی پیش کی ہے) کہ حضرت عائشہ کی عمر شادی کے وقت چھ سال تھی۔ اس وقت علم گنجائش مانع ہے ہم آئندہ اشاعت میں اس نقطہ پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ اور یہ بتائیں گے کہ یہ بات کس قدر غلط ہے۔

قرآنی فکر کی اشاعت کا نیا طریقہ

اس وقت قرآنی فکر کی اشاعت کے ستقل ذرائع، مجلہ طلوع اسلام۔ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتابیں اور محترم پرویز صاحب کا درس قرآن ہیں لیکن اول الذکر کا دائرہ محدود اور ثانی الذکر کا اثر مقامی ہے۔ اس دائرہ کو وسعت دینے کے خیال سے اب یہ کیا گیا ہے کہ طلوع اسلام کے اہم مضامین کو پمفلٹوں کی شکل میں الگ شائع کر دیا جاتا ہے۔ اور ان کی قیمت برائے نام رکھی جاتی ہے۔ تاکہ ان کی اشاعت زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ طلوع اسلام کے دور اول میں اس طریق سے نمایاں کامیابی ہوئی تھی۔ اور ہمیں امید ہے کہ اگر آپ حضرات نے اس میں تعاون کیا تو یہاں بھی یہ تجربہ کامیاب رہیگا۔ اس سے پہلے اس سلسلہ میں دو پمفلٹ شائع ہوئے تھے

(۱) ردنی کا مسئلہ (۲) اور (۲) علماء کون ہیں؟ (۱) اب ان میں دو کا اور اضافہ کیا گیا ہے۔

(۳) تکذیب دین کون کرتا ہے۔ (۱) اور (۴) اطاعت رسول (۱) بزم بلئے طلوع اسلام سے بالخصوص اور دیگر قارئین سے بالعموم درخواست ہے کہ وہ ان پمفلٹوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگا کر اپنے اپنے حلقہ میں تقسیم کریں۔ تاکہ قرآنی فکر کی اشاعت عام ہو جائے۔

(۲) قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا" اسے قرآنی تحریک طلوع اسلام کا منشور سمجھنا چاہیئے اسے پمفلٹوں کے ہمراہ مفت تقسیم کیلئے روانہ کیا جاتا ہے

(۳) پمفلٹوں کے متعلق اپنی ضروریات سے بہت جلد اطلاع دیں تاکہ موجودہ ایڈیشن ختم ہو جانے کی صورت میں نئے ایڈیشن کا انتظام کیا جا سکے (۴) مناسب ہوگا کہ آپ اپنی مستقل ضرورت سے مطلع فرمائیں تاکہ خط و کتابت میں وقت ضائع نہ ہو اور ہر تازہ پمفلٹ کے تیار ہوتے ہی اتنی تعداد از خود آپ کو بھیجدی جایا کرے (۵) پمفلٹ بذریعہ وی پی بھیجے جاتے ہیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۳/۱۵۹۔ ایل (پی ای سی ایچ سوسائٹی) کراچی ۲۹

قرآنی تعلیم کے دو اہم گوشے

تکذیبِ دین کون کرتا ہے

اور

مُصَلّی کسے کہتے ہیں؟

ایک بصیرت افروز مقالہ جسے "سلیم کے نام خطوط" کے سلسلہ میں لکھا گیا۔

سلیم کے نام

قبل اس کے کہ میں ان نقاط کو سامنے لاؤں جن کی تم تشریح چاہتے ہو ایک دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے: پہلی یہ کہ صلٰی (جس سے لفظ صلوٰۃ آتا ہے) کے بنیادی معنی ہیں ٹھیک ٹھیک کسی کے پیچھے چلتے جانا تاآنکہ منزل مقصود آجائے۔ چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت تاج العروس میں حضرت علیؓ کی ایک روایت درج ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ سَبَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَصَلّٰی اَبُوْبَکْرٍ وَثَلَّثَ عُمَرُ۔ یعنی سب سے پہلے رسول اللہؐ تشریف لے گئے (وفات پاگئے) ان کے پیچھے حضرت ابوبکرؓ گئے (صلّٰی) اور تیسرے نمبر پر حضرت عمرؓ نے وفات پائی۔ اس سے لفظ صلّٰی کا استعمال اور اس کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی جو آگے آگے جارہا ہو اس کے پیچھے پیچھے چلنا۔ اور اس طرح چلتے چلے جانا تاآنکہ منزل مقصود پر پہنچ جائیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے صلوٰۃ کے بنیادی معنی ہوں گے قوانین خداوندی کی پوری پوری اتباع۔ خدا کی راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلے جانا۔ ظاہر ہے کہ یہ اتباع زندگی کے کسی ایک گوشے تک محدود نہیں رہے گی بلکہ انسان کی پوری کی پوری زندگی اس کے اندر آجائے گی۔ اس لئے اس کے معنے ہوں گے زندگی کے ہر شعبے میں قوانین خداوندی کا اتباع۔ ان فرائض منصبی کی تکمیل جو انسان پر ان قوانین کی رو سے عاید ہوتے ہیں۔ وہ نظام جس کے اندر رہتے ہوئے انسان ان فرائض کی تکمیل کرسکتا ہے۔ دین کہلاتا ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا نظام دین کا پورا نظام ہوگا۔ صلوٰۃ کے اجتماعات (جنھیں نماز کہا جاتا ہے) اسی نظام کا ایک حصہ ہیں۔ یہ درحقیقت عملی مظاہرہ ہے اس ایمان کا کہ ہم نے اپنی پوری زندگی قوانین خداوندی کے تابع بسر کرنی ہے۔ اور ان کے علاوہ اور کسی قانون اور فیصلے کے سامنے جھکنا نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ صلوٰۃ کا تصور صرف اجتماعاتِ نماز تک محدود نہیں بلکہ انسان کی ساری زندگی کو محیط ہے۔ یعنی جب ہم نماز ادا کرلیں تو ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم فریضۂ صلوٰۃ سے بالکلیہ فارغ ہوچکے ہیں۔ ہمیں سمجھنا یہ چاہیئے کہ ہم نے فریضۂ صلوٰۃ کے ایک حصہ کو ادا کیا ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت ہوگی جب ہم اپنی پوری زندگی کو نظام خداوندی کے تابع بسر کریں۔ اور اس طرح بسر کرتے جائیں تاآنکہ ہماری دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہوجائے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔

صلّٰی کے معنی یہ بات کہ صلّٰی کے معنے کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں۔ قرآن کریم نے خود واضح کردیئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ القیمۃ میں ہے فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (۷۵/۳۱)۔ یہاں دیکھو صَدَّقَ کے مقابلے میں کَذَّبَ آیا ہے (صَدَّقَ کے معنی ہیں تصدیق کرنا۔ سچ کر دکھانا۔ اور کَذَّبَ کے معنی ہیں تکذیب کرنا۔ جھٹلانا) اور صلّٰی کے مقابل میں تَوَلّٰی آیا ہے۔ تَوَلّٰی کے معنی ہیں گریز کی راہیں نکالنا۔ پھر جانا۔ لوٹ جانا۔ اس سے ظاہر ہے کہ صلّٰی اس روش کی ضد ہے۔ جس میں انسان سیدھے راستہ پر چلنے کی بجائے اس سے پھر جاتا ہے یا گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ یہاں سے واضح ہے کہ صلّٰی کے معنی (خود قرآن کی رو سے بھی) کسی کے پیچھے سیدھے راستے پر چلنا ہیں۔ دوسرے مقام پر خود صلوٰۃ کا لفظ بھی انہی معنوں میں آیا ہے۔ سورۂ نور میں کائنات کی مختلف اشیاء کے اجمالی

اور پرندوں کے خصوصی ذکر کے بعد کہا ہے کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ (۲۴/۴۱) ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں صلوٰۃ کے معنی وہ نماز نہیں جو مساجد میں ادا کی جاتی ہے۔ بلکہ اس کے معنی ہیں وہ فرائض منصبی جو ان اشیائے کائنات کے ذمے لگائے گئے ہیں۔ یعنی اس قانون کی اتباع جس کے مطابق چلنے کے لئے انھیں پیدا کیا گیا ہے (تسبیح کے معنی ہیں فرائض کی تکمیل میں پوری پوری جدوجہد کرنا) یہ وجہ ہے کہ میں اقامتِ صلوٰۃ کا ترجمہ نظامِ صلوٰۃ کا قیام کرتا ہوں۔

نظامِ صلوٰۃ

صلوٰۃ کے اجتماعات اس نظام کے اندر آجاتے ہیں۔ لیکن صلوٰۃ کا فریضہ ان اجتماعات تک ہی محدود نہیں۔ ان سے باہر بھی ہے۔ بالفاظِ دیگر خدا کی اطاعت صرف مسجد کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے انسان جب اجتماعِ صلوٰۃ میں شریک ہوتا ہے تو اس وقت بھی اقامتِ صلوٰۃ کر رہا ہوتا ہے۔ اور اس سے فارغ ہو کر جب زندگی کے دوسرے معاملات میں قانونِ خداوندی کی اطاعت کرے اس وقت بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی کرتا ہے۔ یہ چیز کہ صلوٰۃ کا دائرہ زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی اپنے اندر لے لیتا ہے۔ خود قرآن سے واضح ہے۔ سورۂ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ کی قوم نے آپ سے کہا کہ يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ (۱۱/۸۷) "اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم انھیں چھوڑ دیں جن کی محکومیت (عبودیت) ہمارے آباء اختیار کرتے چلے آئے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت کو اپنی مرضی کے مطابق صرف نہ کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مال و دولت کا قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا بھی صلوٰۃ کے اندر داخل ہے۔

امید ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ میں یہ نہیں کہتا کہ صلوٰۃ سے مطلب نماز کے اجتماعات نہیں (لفظ نماز عربی زبان کا نہیں قدیم فارسی زبان کا ہے) میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اجتماعات بھی فریضۂ صلوٰۃ کے اندر داخل ہیں۔ لیکن یہ فریضہ یہیں تک ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ انسان کی پوری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ جو انسان نماز کے اجتماعات میں شریک نہیں ہوتا۔ وہ بھی تارکِ صلوٰۃ ہے۔ اور جو کسی معاملہ میں قانونِ خداوندی کے علاوہ کسی اور قانون کی اطاعت کرتا ہے وہ بھی تارکِ صلوٰۃ ہے۔ میں اس نقطہ پر زور اس لئے دیتا چلا آرہا ہوں کہ جب ہم نماز پڑھ لیتے ہیں تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہم اقامتِ صلوٰۃ کے فریضہ سے کلیتہً فارغ ہو چکے ہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہم اقامتِ صلوٰۃ کے صرف ایک گوشے سے فارغ ہوئے ہیں۔ یہ فریضہ مکمل طور پر اس وقت ادا ہو گا جب ہم اپنی ساری زندگی خدا کے قانون کے تابع بسر کریں گے۔ فقط نماز پڑھ لینا اور باقی زندگی خدا کے احکام کے خلاف گذار لینا انسان کو مصلی نہیں بنا سکتا۔ مصلی وہی ہے جو ساری زندگی خدا کے قانون کے پیچھے پیچھے چلے۔ اس حقیقت کو سورۂ مریم کی ایک آیت میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے مختلف انبیائے کرام کا ذکر ہے۔ جنھیں اللہ نے اپنے انعامات سے نوازا۔ اس کے بعد یہ کہ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (۱۹/۵۹) یعنی ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو گئے جنھوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ اور اپنے خیالات و خواہشات کے پیچھے چل پڑے۔ اس سے ظاہر

اضاعوا الصلوٰۃ

ہے کہ زندگی کی دو روشیں ہیں۔ ایک روش یہ ہے کہ انسان اپنے خیالات اور مفاد کے پیچھے چلے اس

کے برعکس دوسری روش یہ ہے کہ انسان وحیٔ خداوندی کی اتباع کرے۔ قرآن کہتا ہے کہ اپنے خیالات اور خواہشات کی اتباع کرنے والے صلوٰۃ کی روش کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لہٰذا صلوٰۃ کے معنی ہوئے وحیٔ خداوندی کی اتباع۔ صلوٰۃ کے ضائع کرنے سے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ صلوٰۃ کی رسمی شکل کو برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن اس کی اصل وغایت کو ضائع کر دیتے ہیں۔ بہرحال اس سے بھی واضح ہے کہ صلوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے تمام معاملات میں وحیٔ خداوندی کی اتباع کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ صلوٰۃ کی حقیقت کو ضائع کرتا ہے۔

یہ تھی پہلی بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس نظام کا تعلق انسانی زندگی کی نشوونما (DEVELOPMENT) سے ہے قرآن اسے خاص اہمیت دیتا ہے۔ بلکہ (اصل یہ ہے کہ) دین کا مقصود اور غایت ہی انسانی زندگی کی نشوونما ہے۔ "انسانی زندگی کی نشوونما میں انسانی جسم (طبعی زندگی) کی نشوونما بھی داخل ہے۔ اور انسانی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما بھی۔ انسانی ذات کی نشوونما سے مفہوم یہ ہے کہ ان تمام صلاحیتوں کی پوری پوری بالیدگی اور ارتقاء جو انسان کے اندر مضمر رکھی گئی ہیں۔ جو حصہ انسان کی طبعی زندگی کی نشوونما سے متعلق ہے اسے معاشی نظام کہتے ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان پوری پوری محنت سے کام کرے۔ اور اپنی ضروریات سے جو کچھ زائد ہو اسے دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا رکھے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "ایتائے زکوٰۃ" کہتے ہیں۔ یعنی نشوونما دینا۔ سامان زیست مہیا کرنا (زکوٰۃ کے معنی نشوونما یا GROWTH کے ہیں) جیسا کہ سورہ ہود کی اس آیت سے واضح ہے جسے (حضرت شعیبؑ کی صلوٰۃ کے ضمن میں اوپر درج کیا گیا ہے) نظام صلوٰۃ کا نظام معاش کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اسی لئے قرآن میں اقیموا الصلوٰۃ اور آتوا الزکوٰۃ بالعموم اکٹھا آتا ہے۔

ایتائے زکوٰۃ

تکذیب دین کون کرتا ہے؟

ان دونوں باتوں کو تمہیداً سمجھ لینے کے بعد اب آگے چلو۔ سورۂ ماعون میں ہے اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (۱۰۷/۱) کیا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا (اس کی حالت پر بھی غور کیا) جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ یہاں دین سے انکار کرنے والوں کا ذکر نہیں۔ دین کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر ہے یعنی وہ جو زبان سے دین کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن عملاً سے جھٹلاتے ہیں۔ تم سوچو سلیم! کہ وہ کون ہے جو اس سوال کا جواب سننے کے لئے ہمہ تن توجہ نہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ معلوم کرے کہ وہ کون ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ دین کی تکذیب کرتا ہے اور پھر کہتا بھی اس طرح ہے کہ یہ بات محض ذہنی یا اعتقادی نہ ہے بلکہ محسوس طور پر دیکھنے والے کے سامنے آجائے (رارایت کا اشارہ اسی طرف ہے) سوال کو ایک مرتبہ پھر سامنے لاؤ۔ یعنی۔

کیا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا جو دین کی تکذیب کرتا ہے

اب اس کا جواب سنو۔ جواب یہ ہے کہ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۰۷/۲) یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا!

تم نے غور کیا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ تمہارے ذہن میں یہ ہوگا کہ قرآن یہ کہے گا کہ دین کی تکذیب وہ کرتا ہے جو خدا کو نہیں مانتا۔ آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ جس کے عقائد درست نہیں (وغیرہ وغیرہ) لیکن قرآن نے یہ نہیں کہا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ دین کی تکذیب وہ شخص کرتا ہے جو ان تمام باتوں کے ماننے کے باوجود یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانے کا انتظام نہیں کرتا۔ جیسا کہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں، عربی زبان میں یتیم صرف اسی کو نہیں کہتے جس کا باپ مر چکا ہو۔ اس کے بنیادی معنی ہیں تنہا رہ جانے والا۔ دنیا کا

یتیم کی عزت

قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ کوئی گروہ، کوئی پارٹی، کوئی جتھہ، کوئی جماعت ہو اس کی معاشرہ میں بڑی عزت ہوتی ہے۔ لیکن جو تنہا رہ جائے۔ اس کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ کوئی اس کی عزت نہیں کرتا بلکہ اسے ہر جگہ دھکے ملتے ہیں۔ جس معاشرہ میں ہر فرد (بجز ان کے جن کے پاس قوت و اقتدار اور جتھے اور گروہ ہوں) اپنے آپ کو تنہا (یتیم) محسوس کرے۔ قرآن کی رو سے وہ معاشرہ جہنمی معاشرہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کس طرح ہر فرد اپنے آپ کو (بھری محفل میں بھی) تنہا محسوس کرتا ہے اس کا علم و احساس ہم میں سے ہر ایک کو ہے۔ لیکن اس جہنم میں صرف ہمیں ماخوذ نہیں۔ یورپ اور امریکہ کی قومیں جو ہم سے بہت آگے ہیں۔ اس باب میں ان کی حالت بھی ہم سے کچھ اچھی نہیں (میں نے شاید تمہیں بتایا ہے یا نہیں) اگلے دنوں امریکہ سے ایک دلچسپ کتاب شائع ہوئی تھی۔ وہاں کے چند نامور صحافیوں (جرنلسٹس) نے مل کر ملک کے اعداد و شمار جمع کئے اور ان کی روشنی میں بتایا کہ ان کے ہاں معاشرہ کی حالت کیا ہے۔ جو کچھ انھوں نے اس کتاب کی تفاصیل میں لکھا ہے تو چھوڑو۔ انھوں نے اپنے معاشرہ کی حالت کا جو نقشہ پیش کیا۔ اس کا اندازہ اس نام (ٹائیٹل) سے لگ سکتا ہے جو انھوں نے اس کتاب کے لئے تجویز کیا تھا۔ انھوں نے اس کتاب کا نام تجویز کیا (THE LONELY CROWD) غور کرو سلیم! کہ یہ نام کس قلبی کیفیت کی غمازی کر رہا ہے۔ میں کہوں گا کہ یہ کتاب کا نام نہیں، ایک چیخ ہے جو اپنے معاشرے کی حالت کو دیکھ کر ان لوگوں کے منہ سے بے اختیار نکل گئی ہے (THE LONELY CROWD) اُف! (CROWD) اور (LONELY) یعنی یہ معاشرہ نہیں بلکہ انسانوں کا ایک ایسا انبوہ یا ہجوم ہے۔ جس میں ہر فرد اتنے افراد کے گرد و پیش ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ امریکہ کے ان مبصرین نے تو اس حقیقت کو اب پایا ہے قرآن اسے اس سے بہت پہلے بیان کر چکا ہے۔ اس نے اس کے لئے بعینہٖ یہی الفاظ استعمال کئے ہیں (بلکہ ان سے بھی زیادہ جامع) اس نے کہا ہے یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۰/۱۵) ایسا معاشرہ جس میں ہر شخص دوسروں کے قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے! دیکھا تم نے سلیم! یوں معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے ان مصنفین نے اپنی کتاب کے ٹائیٹل کے لئے قرآن کی اس آیت کا ترجمہ کر دیا ہے۔

دوسرا نکتہ قرآن نے کہا ہے وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ۔ مسکین (سَکُنَ۔ سَاکِنٌ) سے ہے اس کے معنے ہیں وہ شخص جو حرکت سے محروم ہو جائے۔ جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ جس میں کام کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہے جو

مسکین

متحرک سے ساکن ہو جائے۔ جو (INCAPACITATED) ہو جائے۔ خواہ کسی وجہ سے ہو۔ ہمارے معاشرے میں ایسا شخص اپنی مصیبت آپ بھگتتا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے۔ نہ کوئی اسے پوچھتا ہے۔ اور نہ اس کے بال بچوں کا پرسانِ

حال ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس معاشرہ میں یہ کچھ ہوتا ہو اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دیکھو سلیم! قرآن نے سورۃ الفجر میں اس حقیقت کو کس قدر دلنشیں الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان جب خدا کی راہ نمائی کی طرف سے آنکھیں بند کر لے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جب اسے فراخیٔ رزق نصیب ہو تو اس پر اترا تا ہے۔ لیکن جب اس پر (اس کے اعمال کے بدلے میں) تباہی آتی ہے تو کہتا ہے رَبِّیْ اَھَانَنِ۔ میرے رب نے مجھے خواہ مخواہ ذلیل و خوار کر دیا۔ قرآن کہتا ہے ایسے لوگوں سے کہدو کہ کلّا ایسا ہرگز نہیں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں پونجی (بغیر کسی جرم اور قصور کے) سزا دیدی! ہرگز نہیں۔ سن رکھو کہ یہ اس لئے ہوا ہے کہ بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۸۹/۱۷-۱۸) تم ان افراد کی جو تمہارہ جاتے تھے عزت نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے رزق کا بندوبست نہیں کرتے تھے۔ جن کی حرکت رک جاتی تھی۔ غور کیا تم نے سلیم! قرآن کہتا ہے کہ وہ افراد جو معاشرہ میں تہارہ جائیں۔ قابل عزت اور واجب التکریم ہیں۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ پرہ جنبہ اور گروہ جتھہ نہ سہی) وہ فرزندانِ آدم (انسان) تو ہیں اور ہم نے ہر فرزندِ آدم کو (محض اس کے آدمی ہونے کی حیثیت سے) واجب التکریم پیدا کیا ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

(ضمناً یہ بھی سمجھ لو سلیم! کہ قرآن نے ان لوگوں کے خلاف صرف یہی دو جرم عائد نہیں کئے کہ وہ یتیموں کی عزت نہیں کرتے تھے اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا۔ تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ تمہیں باپ دادا کی طرف سے میراث میں مل جاتا ہے وہ سب تمہارا اکیلوں کا حق ہے۔ اس لئے تم اسے سمیٹ کر کھا جاتے ہو وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۱۹-۲۰) اور ایسا جال بچھاتے ہو جس سے لوگوں کا مال ادھر ادھر سے لڑھک کر سب تمہارے ہاں جمع ہو جائے۔ یہ وجہ ہے تمہاری تباہی و بربادی کی)

اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن تو یہاں تک کہتا ہے کہ مسکینوں کے رزق کا بندوبست نہ کر سکنے والے اور خدا پر ایمان نہ لانے والے ایک ہی ہیں۔ یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں جو مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتا۔ وہ درحقیقت خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ اہلِ جہنم کے متعلق کہتا ہے اِنَّہٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۶۹/۳۳-۳۴) وہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے تھے (عربی زبان میں واؤ کے معنی اور بھی ہوتے ہیں۔ اور یعنی بھی۔ اس جگہ (و) کے معنی اور کے جائیں۔ یا یعنی مفہوم وہی ہے کہ ایمان باللہ اور اطعام المسکین ساتھ ساتھ چلتے ہیں)

اب پھر تم سورۃ ماعون کی طرف آؤ جہاں سے یہ بات چلی تھی۔ یعنی اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ۔ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ۔ یعنی تکذیب دین وہ کرتے ہیں جو یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور مسکینوں کے رزق کا انتظام نہیں کرتے۔ اس کے بعد ہے فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ (۱۰۷/۴-۵) سو تباہی ہے ان مصلین (نمازیوں) کے لئے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

مصلّین

تم حیران ہو گے سلیم! کہ پیچھے سے جو بات چلی آ رہی تھی وہ خالص معاشی مسئلہ سے متعلق تھی (یعنی مسکین کے رزق کا انتظام) اور اس

کے بعد مصلین کا ذکر آگیا اور ذکر بھی بیا رت) کے ساتھ (فَوَيْلٌ) جس کا عربی زبان میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ..... بالفاظ دیگر قرآن نے کہا ہے کہ تکذیب دین وہ کرتے ہیں جو یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور مسکینوں کے رزق کا اہتمام نہیں کرتے۔ سو ان مصلین کے لئے تباہی ہے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اس سے وہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے جس کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ یعنی صلوٰۃ اور معاشی نظام کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور یہ صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبری اور غفلت کا نتیجہ ہے کہ انسان اسے محض پرستش کا طریق سمجھتا ہے اور معاشرتی اور معاشی نظام کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں محسوس کرتا۔ یہ ان کی بھول ہے۔ قرآن کی میزان میں کامیاب مصلین وہ ہیں جو اپنے معاشرتی اور معاشی نظام کو قوانین خداوندی کے تابع رکھتے ہیں۔ اگر کسی قوم میں معاشرتی اور معاشی نظام غیر خداوندی خطوط پر تشکل ہوں تو ان کے مصلین (نمازیوں) کی صلوٰۃ (نماز) صلوٰۃ نہیں کہلا سکتی۔ ایسی صلوٰۃ کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی بھول یہ ہے کہ یہ صلوٰۃ کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ فقط نام ہے ان ارکان و تعدیل کا جو مرئی اور محسوس (VISIBLE AND PERCEPTIBLE) ہیں۔ جو دوسروں کو نظر آسکتے ہیں جنھیں دیکھ کر لوگ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں نمازی ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ (۶-۴) وہ ان ظاہری حرکات و سکنات (قیام۔ رکوع۔ سجود رکعات وغیرہ) کو ادا کرکے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضۂ صلوٰۃ سے فارغ ہوگئے۔ حالانکہ یہ ظاہری حرکات، حقیقی صلوٰۃ کے مظاہر (SYMBOLS) ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ظاہری حرکات بھی ضروری ہیں۔ کیونکہ حقیقت کے اظہار کا ذریعہ مجازہی ہوتا ہے۔ لیکن صلوٰۃ ان حرکات کے مجموعہ ہی کا نام نہیں۔ صلوٰۃ کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ وہ مفہوم کیا ہے اسے قرآن نے اگلی آیت میں واضح کردیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ تم اس اگلی آیت تک پہنچو، جو کچھ پہلے کہا جاچکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لے آؤ یعنی

(۱) کیا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جو تکذیب دین کرتا ہے؟

(۲) یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے رزق کا اہتمام نہیں کرتا۔

(۳) لہذا تباہی ہے ان مصلین کے لئے جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

(۴) یعنی جو اس چیز ہی کو صلوٰۃ سمجھتے ہیں جسے لوگ دیکھ سکیں۔

اور اس کے بعد ہے

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (۱۰۷)

یعنی ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ نماز کی حرکات و سکنات بڑی باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن رزق کے جن سرچشموں کو بہتے پانی کی طرح کھلا رہنا چاہیئے تھا۔ انھیں بند لگا لگا کر روک لیتے ہیں۔ تاکہ وہ انہی کے لئے مخصوص ہوجائیں اور دوسرے انسان ان سے متمتع نہ ہوسکیں۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن کس طرح معاش سے صلوٰۃ، اور صلوٰۃ سے معاش کی طرف رجوع کرتا ہے؟ پہلے اس نے تکذیب دین کے سلسلہ میں یتامیٰ و مساکین کی بات چھیڑی تو اس سے مصلین کا ذکر سامنے لے آیا۔ اس کے بعد

مصلین کی غلط روش کا ذکر کیا تو اس سے یمنعون الماعون کا معاشی پہلو نکل آیا۔ اس طرح یہ حقیقت سامنے آگئی کہ صلوٰۃ و معاش میں کس قدر گہرا تعلق ہے اور تکذیب دین کرنے والے وہ مصلین ہیں جو صلوٰۃ کے رسوم و ظواہر کے پابند تو ہوتے ہیں، لیکن معاشی نظام کو قوانین خداوندی کے تابع نہیں رکھتے۔ اسی سے تم نے یہ بھی دیکھا سلیم! کہ قرآن کریم کی آیات کس قدر مربوط ہیں؟ لیکن یہ ربط و نظم اس صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے کہ انسان کے سامنے دین کا وہ مرکزی تصور (CENTRAL IDEA) ہو جسے قرآن بطور اصل الاصول کے پیش کرتا ہے۔ اس تصور کی روشنی میں صاف نظر آجاتا ہے کہ قرآن کی تمام آیات کس طرح اس محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔ لیکن اگر اس کا یہ مرکزی تصور سامنے نہ ہو تو پھر اس میں کوئی ربط و نظم دکھائی نہیں دیتا۔ یہ جو تم نے اکثر مولوی صاحبان سے سنا ہے کہ قرآن میں (معاذ اللہ) کوئی ربط نہیں تو اس کی وجہ یہی ہے۔ ورنہ خدا کی کتاب اور بے ربط!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

ان حضرات سے کون کہے کہ

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن کن لوگوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ تکذیب دین کرتے ہیں؟ اب یہ دیکھو کہ وہ اس مرکزی خیال کی توضیح و تشریح مختلف مقامات پر کس انداز سے کرتا ہے قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک بات کو ایک جگہ بطور اصول بیان کرتا ہے اور پھر دوسرے مقامات پر اس کی تشریح کرتا ہے۔ کبھی اس کے مطابق مثالوں اور تشبیہوں سے اور کبھی اس کی ضد (JUXTAPOSITION) سے۔ سورۂ مدثر میں ہے کہ اہل جنت اہل جہنم سے پوچھیں گے کہ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ (۷۴/۴۲) تمہارا وہ کونسا جرم تھا جو تمہیں جہنم میں کھینچ لایا؟ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ (۷۴/۴۳-۴۴) وہ جواب دیں گے کہ ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔ یعنی (یا۔ اور) ہم مساکین کے کھانے کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ (۷۴/۴۵) البتہ ہم باتیں بہت بنایا کرتے تھے۔ بلند آہنگ دعاوی کیا کرتے تھے۔ جاذب نگاہ پلان بنایا کرتے تھے۔ امید افزا اسکیمیں تیار کیا کرتے تھے۔

اہل جہنم

اس کے بعد ہے وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ (۷۴/۴۶) اور اس طرح ہم دین کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ دیکھا تم نے سلیم! وہی صلوٰۃ (مصلین) اور طعام المسکین کا ذکر اور وہی تکذیب دین! یہاں دین کے بجائے یوم الدین آیا ہے۔ یوم کے معنی ہیں۔ زمانہ یا دور (TIME ; AGE ; PERIOD) یعنی وہ دور جس میں نظام خداوندی متشکل ہو کر سامنے آجائے جس میں انسانی اعمال اپنے نتائج کو محسوس پیکروں میں سامنے لے آئیں۔ جس میں مکافات عمل کا قانون ایک حقیقت ثابتہ بن کر

نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ ان جہنمیوں کا اعتراف یہ ہوگا کہ ہم ان لوگوں میں شامل نہیں تھے جو صلوٰۃ کی حقیقت پر نگاہ رکھ کر قیام صلوٰۃ پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اور اس طرح ایسا نظام قائم کرتے تھے جس میں مساکین کے رزق کا انتظام بہ حسن و خوبی ہو جائے۔ یوں ہم دین کے نظام کی عملاً تکذیب کرتے تھے۔ یعنی اپنی روش سے دنیا پر ثابت کر دیتے تھے کہ یہ دعوےٰ کہ صلوٰۃ کے ذریعے ایسا نظام عمل میں آسکتا ہے جس میں معاشی مسائل کا اطمینان بخش حل مل جائے جھوٹا ہے نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ۔

ناپ تول پورا نہ کرنے والے

سورہ تطفیف کا تو آغاز ہی اس موضوع سے ہوتا ہے۔ ارشاد ہے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ان لوگوں کے لئے تباہی ہے جو معاشی معاملات میں توازن قائم نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کے حقوق و واجبات میں کمی کر دیتے ہیں اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۸۳:۲-۳) یعنی وہ لوگ کہ جب وہ دوسروں سے لیتے ہیں تو پورے ماپ سے لیتے ہیں۔ لیکن جب دوسروں کو دیتے ہیں تو ماپ اور وزن میں کمی کر دیتے ہیں۔ دیکھا تم نے سلیم! قرآن نے سرمایہ دار طبقہ کی روش اور ذہنیت کو کیسے جامع انداز میں بیان کیا ہے؟ ماپ اور تول پرانے زمانے کے پیمانوں اور ترازوؤں کے ذریعے ہو یا دور حاضرہ کی اقتصادی اسکیموں کے ذریعے ذہنیت ہر جگہ وہی کارفرما ہے۔ اس کے بعد چند آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور اس کے بعد ہے وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔ اس دور میں (يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۸۳:۶ جب تمام نوع انسانی خدا کی عالمگیر ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی) ان مکذبین (تکذیب کرنے والوں) کے لئے تباہی ہوگی اَلَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۸۳:۱۱) یعنی ان لوگوں کے لئے جو یوم الدین کی تکذیب کرتے تھے۔

دیکھا تم نے سلیم! یہاں بھی مکذبین انہیں کہا گیا ہے جو معاشی نظام کو عدل کی بنیادوں پر استوار نہیں کرتے۔

تصدیق دین

یہ تو ہوا تکذیب دین کا بیان۔ اب یہ دیکھو کہ وہ اس کے مقابلے میں "تصدیق دین" کو سامنے لا کر کس طرح اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔ یعنی اس نے اوپر یہ بتایا تھا کہ تکذیب دین کون کرتا ہے۔ اب یہ بتلائے گا کہ تصدیق دین کون کرتے ہیں۔ ذرا غور سے سنو کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ سورۃ معارج میں ہے کہ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۷۰:۱۷) جہنم آوازیں دے دے کر بلاتی ہے اس کو جو سیدھے راستے سے منہ پھیر کر چل دیتا ہے یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ یہ تو اصولی بات ہوئی۔ اس کے بعد اس اصول کی تشریح سامنے آتی ہے۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى یہ وہ ہے جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر تھیلی کا منہ کس کر باندھ دیتا ہے کہ یہ مال کسی اور کے کام نہ آسکے۔ دوسری جگہ ہے جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (۱۰۴:۲) جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے کہ کتنا ہو گیا اور اس میں کتنا اور ڈالا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ کسی خاص شخص کی بات نہیں ہے۔ انسان اگر وحی کی راہ نمائی کے پیچھے نہ چلے تو اس کی حالت بالعموم یہ ہوتی ہے کہ وہ بہت بے صبرا اور حریص ہو جاتا ہے اس کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰:۱۹) اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا

مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۷۰/۲۱) جب اس پر مصیبت آتی ہے تو واویلا مچانے لگ جاتا ہے۔ اور جب اسے مال و دولت مل جاتا ہے تو اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچتا کہ جس طرح اسے تنگ دستی کے زمانے میں مال کی ضرورت تھی۔ اسی طرح اس مال کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جو اس وقت تنگ دست ہیں۔ (یہ وہی کیفیت ہے جسے سورۂ ماعون میں وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ سے تعبیر کیا گیا ہے) اس کے بعد قرآن بتاتا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت سے صرف مصلین بچ سکتے ہیں۔ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (۷۰/۲۲-۲۳) وہ مصلین جو صلوٰۃ کی مداومت کرتے ہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی معاملہ میں قانونِ خداوندی کے مطابق فیصلہ کر لیا۔ اور کسی میں اس کے خلاف چل پڑے۔ یا کبھی ان قوانین کی اتباع کر لی اور کبھی ان سے گریز کی راہیں تراشنی شروع کر دیں۔ مصلین وہ ہیں جو اس صحیح روش کو اختیار کر کے استقامت اور استقلال سے اس پر جمے رہتے ہیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ ابتدا میں بات خالص معاشی مسئلہ کے متعلق ہو رہی تھی (کہ انسان کی عام ذہنیت یہ ہے کہ وہ مال و دولت سمیٹتا چلا جاتا ہے اور اس سے اس کا جی ہی نہیں بھرتا) اور اس کے بعد فوراً مصلین کا ذکر آ گیا۔ اس سے پھر یہ واضح ہو گیا کہ قرآنی نظام میں معاش اور صلوٰۃ کا کس قدر گہرا تعلق ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ مصلین کے بعد قرآن کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۴) یعنی وہ لوگ جن کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا حق ہے اور حق بھی مبہم نہیں بلکہ واضح اور معلوم۔ سائل اسے کہتے ہیں جس کی ضروریات کے پورا ہونے میں کمی رہ جائے۔ اور محروم اسے کہتے ہیں جو اپنی ضروریات پورا کرنے کے بالکل قابل نہ ہو۔ پھر یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ دولت مند۔ محتاجوں اور مفلسوں کو خیرات کے طور پر کچھ دے دے۔ بالکل نہیں۔ خیرات پر زندگی بسر کرنا انسان کی انتہائی ذلت ہے اور احترامِ آدمیت کے خلاف قرآن گداگروں کی جماعت نہیں پیدا کرتا۔ اس لئے اس نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے نظام میں ہر محتاج و محروم اپنے لئے سامانِ زیست اور اسبابِ نشوونما بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) حاصل کرتا ہے۔ یہ نہ خیرات ہے۔ نہ کسی کا ان پر احسان۔ اسی لئے قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جن کے پاس فاضل دولت ہے وہ اسے اپنے زیردستوں کی طرف لوٹا کیوں نہیں دیتے؟ (فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ۱۶/۷۱) یعنی یہ فاضلہ دولت درحقیقت ان کا حق ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ اس لئے اسے ان کی طرف لوٹا دینا چاہیئے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ان آیات کا ترجمہ ایک بار پھر سامنے لے آئیے جو اوپر درج کی جا چکی ہیں۔ یعنی

جہنم اس شخص کو آوازیں دے دے کر بلاتی ہے جو یا تو سیدھے راستے سے منہ پھیر کر چل دیتا ہے اور یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔

یعنی اس شخص کو جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے کس کر باندھ رکھتا ہے

یہ اس لئے کہ انسان جب اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے چلتا ہے تو اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے

کہ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ واویلا مچاتا ہے اور جب مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے تو اسے سمیٹ کر رکھ لیتا ہے۔

لیکن اس ذہنیت سے مصلین بچے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنی صلوٰۃ پر مداومت سے قائم رہتے ہیں۔

یعنی وہ لوگ جن کے مال و دولت میں محتاجوں اور محرموں کا حق معلوم ہوتا ہے۔

اور اس کے بعد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۷۰/۲۶)

یعنی وہ لوگ جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ قرآن کس طرح تصریف آیات (آیات کو پھیر پھیر کر لانے) سے اپنی مرکزی تعلیم کی وضاحت کرتا ہے۔ پہلے اس نے بتایا تھا کہ دین کی تکذیب کون کرتے ہیں۔ اور اب بتایا کہ اس کی تصدیق کون کرتے ہیں۔ اس تفصیل کو اس نے سورۃ "القیمۃ" کی اور مختصر سی آیات میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے (جو پہلے بھی لکھی جا چکی ہے اور) جس میں کہا گیا ہے کہ دردناک عذاب میں وہ مبتلا ہوتا ہے جو

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۔ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۷۵/۳۱-۳۲)

جو نہ تصدیق کرتا ہے اور نہ قانونِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتا ہے بلکہ وہ تکذیب کرتا ہے اور اس راستے سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ "تکذیب کرنے والے اور گریز کی راہیں نکالنے والے" کے لئے قرآن نے فرعون کو بطور مثال پیش کیا ہے جس کے عہد میں ملوکیت (فرعون) پیشوائیت (ہامان) اور سرمایہ داری (قارون) بیک وقت جمع تھیں۔ چنانچہ سورہ طٰہٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا کہ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۲۰/۴۸) ہماری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ خدا کا عذاب اس پر ہوتا ہے جو تکذیب کرتا ہے اور گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ اور اس طرح زندگی کی صحیح روش سے پھر جاتا ہے۔

سورۂ لیل میں تکذیب و تصدیق کے تقابل کو ایک اور انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (۹۲/۴) یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں مختلف لوگوں کی تگ و تاز کا رخ مختلف سمتوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان تمام سمتوں کو سمٹایا جائے تو یہ اصولی طور پر دو قسموں میں تقسیم ہو جائیں گی۔ یہ دو سمتیں اور ان کے نتائج یہ ہیں

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (۹۲/۵-۶) سو جو شخص دوسروں کو دے گا اور تقویٰ شعار

دینے والے بن جائے گا اور اس طرح ہمواریاں پیدا کرنے والے دین کی تصدیق کرے گا۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (۹۲/۷) تو ہم اس پر فراخیوں کی راہ آسان کر دیں گے۔ اس کے برعکس

وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى. وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (۹۲/۸-۹) جو شخص سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لے گا۔ اور اپنے آپ کو معاشرے سے مستغنی سمجھ لے گا۔ یعنی یہ خیال کرے گا کہ میرے پاس اس قدر مال و دولت ہے۔ اس لئے مجھے دوسروں کی کیا محتاجی ہے۔ میں ان کی کیا پرواہ کرتا ہوں۔ اور اس طرح ہمواریاں پیدا کرنے والے دین کی تکذیب کرے گا۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (۹۲/۱۰) تو ہم اس پر تنگ دستی کے راستے کشادہ کر دیں گے۔

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى (۹۲/۱۱) اور جب اس کی تباہی کا وقت آئے گا۔ تو اس کا مال و دولت اس کے کسی کام نہ آسکیگا۔ یہ اسے اُس تباہی سے کبھی نہیں بچا سکے گا جو اس کی سرمایہ دارانہ روش کا لازمی نتیجہ ہے۔

وہ اس روش کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ انسان کو اپنے مال و دولت کے معاملہ میں اپنی مرضی اور اپنے فیصلوں کے مطابق ہی چلنا چاہیئے۔ لیکن یہ غلط ہے اس باب میں انسان کو وحیٔ خداوندی کے تابع چلنا چاہیئے۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (۹۲/۱۲) راہ نمائی دینا ہمارا کام ہے۔ اس لئے کہ انسان ہمیشہ اپنی ذاتی مصلحت اور پیش پا افتادہ مفاد ہی کو سامنے رکھتا ہے اور مستقبل پر اس کی نگاہیں نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس

وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (۹۲/۱۳) ہمارے سامنے حال بھی ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔ ہمارے پیش نظر اس طبعی زندگی کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد کی زندگی کی بالیدگی بھی۔ انسان کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے۔ اور ہمارے سامنے پوری نوع انسانی کا مفاد کلی۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبود ہمہ

جو شخص (یا نظام) مفادِ خویش ہی کو مقصودِ حیات سمجھتا ہے۔ اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (۹۲/۱۴) سو میں تمہیں اس شعلہ انگیز آتش سوزاں سے متنبہ کرتا ہوں جو سب کچھ تباہ کر کے رکھ دیا کرتی ہے۔

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۹۲/۱۵) اس میں صرف وہی داخل ہوتا ہے جو شقی ہوتا ہے یعنی وہ جو تکذیب کرتا ہے اور گریز کی راہیں نکالتا ہے اس کے برعکس

متقی کون ہے

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى (۹۲/۱۶) اور اس سے اُسے محفوظ رکھا جاتا ہے جو متقی ہو۔ اب سوال پیدا ہوا کہ متقی کسے کہتے ہیں۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دیدیا۔

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸) یعنی وہ جو اس کے لئے مال دیتا ہے کہ اس سے (اس کی اپنی ذات کی اور دیگر افراد انسانیہ کی) نشوونما ہو سکے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ ان آیات سے دیگر امور کے علاوہ متقی کا مفہوم بھی کس طرح واضح ہو گیا۔ یعنی متقی بھی وہ ہے جو اپنا

مال دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ اور اس طرح اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی دیکھو کہ تقویٰ اور معاشی معاملات کا تعلق کس قدر گہرا ہے۔ جو لوگ تقویٰ اور "تزکیۂ نفس" کا کچھ اور مفہوم سمجھتے ہیں۔ اور ان کا تعلق "روحانیت" (یعنی ان کی مصطلح روحانیت) سے قرار دیتے ہیں۔ ان کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا۔ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (۵۳/۳۲) تم اپنی ذات کی نشوونما (تزکیہ) کا فیصلہ خود ہی (اپنے معیاروں کے مطابق) نہ کرنے بیٹھ جاؤ۔ اسے بہترین طور پر خدا ہی جانتا ہے کہ متقی کسے کہتے ہیں۔ متقی اسے کہتے ہیں اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸) جو اپنا مال دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ اور اس طرح اس کی ذات کا تزکیہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ کہتا ہے۔ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى (۵۳/۳۳) کیا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جو گریز کی راہیں نکالتا ہے؟ یعنی وہ شخص

وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى (۵۳/۳۴) جو مرتا بھرتا کچھ دیتا بھی ہے تو بہت تھوڑا سا دیتا ہے اور پھر پتھر کی طرح سخت ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

متقی کون نہیں؟

سورۂ لیل میں تم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قرآن نے اَتْقٰى (متقی) کے مقابلہ میں اَشْقٰى (شقی) کو پیش کیا ہے۔ جس کے متعلق کہا ہے کہ وہ جہنم کے تباہ کن عذاب میں مبتلا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ شقاوت کسے کہتے ہیں؟ قرآن نے سورۂ طٰہٰ میں بڑے واضح الفاظ میں اس کی تشریح کی ہے۔ اس سورۃ کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى (۲۰/۲) ہم نے قرآن کو اس لئے نہیں نازل کیا کہ تو شقاوت میں مبتلا ہو جائے۔ شقاوت کے معنی ہیں۔ سعادتوں سے محروم رہ جانا۔ جگر پاش مشکلات میں مبتلا ہو جانا۔ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو قوم قرآن کے مطابق زندگی بسر کرے گی۔ وہ کبھی زندگی کی سعادتوں سے محروم نہیں رہے گی۔ اور اسے جگر پاش مشقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی سعادتیں کیا ہیں۔ اور جگر پاش مشقتیں کسے کہتے ہیں۔ اس کی تشریح آگے چل کر قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں اس طرح کر دی۔ فرمایا کہ آدم جنت میں تھا جہاں اس کی زندگی اس نہج سے گذر رہی تھی کہ اسے نہ بھوک کا خوف تھا نہ پیاس کا۔ نہ لباس کی فکر تھی نہ مکان کی۔ یہ سب ضروریات زندگی نہایت آسانی سے اور با افراط (رَغَدًا) پوری ہوتی جاتی تھیں (اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۹) اس کے بعد ہے کہ ہم نے آدم سے کہہ دیا کہ دیکھنا! تم نے کہیں اس راستے کو چھوڑ کر ابلیس کی راہ اختیار نہ کر لینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہیں اس جنت سے نکال دے گا فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ (۲۰/۱۱۷) تو اس سے کیا ہوگا فَتَشْقٰى (۲۰/۱۱۷) تو اس کا نتیجہ "شقاوت" ہوگا۔ یعنی تو ان تمام چیزوں سے محروم ہو جائے گا جو تمہیں اس وقت اس فراوانی سے حاصل ہیں۔ اور ان کے حصول کے لئے تجھے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔

اس کے بعد ہے آدم ابلیس کے فریب میں آ گیا۔ اور اس طرح اس زندگی کی آسائشوں سے محروم ہو گیا۔ اس سے آدم سخت مایوس اور افسردہ خاطر ہو گیا۔ اس نے خدا سے کہا کہ کیا اب اس کے لئے اس پہلی (جنتی) زندگی کو دوبارہ حاصل کرنے

کرنے کی کوئی صورت نہیں؟ جواب ملا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ تمام فراوانیاں اور آسائشیں تمہیں پھر سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ تم (اپنے خیالات کی اتباع چھوڑ کر) ہماری راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۲۰/۱۲۳) کہ نہ تمہاری محنت رائگاں جائے گی اور نہ ہی تو شقاوت میں پڑے گا۔ اس کے برعکس وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴) جو شخص ہمارے ضابطۂ قوانین سے پہلو تہی کرے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور صرف یہی نہیں کہ اس کی یہاں کی روزی تنگ ہو جائے گی بلکہ وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) ہم سے ہم قیامت کے دن اندھا اٹھائینگے تم نے دیکھا سلیم! کہ اتقیٰ کے مقابلہ میں جو اشقیٰ آیا ہے۔ اس میں اشقیٰ کے معنی کیا ہیں؟ یعنی وہ جو زندگی کی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو اور اس کے لئے اسے جگر سوز مشقتیں اٹھانی پڑیں۔ لہٰذا متقی وہ ہے جسے زندگی کی تمام ضروریات اور سعادتیں بافراط میسر ہوں اور وہ اپنی محنت کی کمائی کو دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا رکھے۔

ان تصریحات سے تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن کی رو سے صلوٰۃ اور معاشی معاملات میں کتنا گہرا تعلق ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ صلوٰۃ صرف اس نماز تک ہی محدود نہیں جو مسجد کی چار دیواری کے اندر ادا کی جاتی ہے بلکہ اس کا دائرہ انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ صلوٰۃ اس نظام کا نام ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ قوانین خداوندی کے پیچھے چلتے ہیں اور اس کے وقتی اجتماعات اس نظام کا ایک حصہ ہیں۔ اس سے تمہاری سمجھ میں یہ بات بھی آجائے گی کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵) "صلوٰۃ فحشا اور منکر سے روک دیتی ہے"۔ تو اس کا مفہوم کیا ہے؟

فحشا و منکر

فحشا کے معنی ہیں بخل اور منکر کے معنی ہیں عقلِ فریب کار کی حیلہ تراشیاں۔ جن کی رو سے انسان سب کچھ اپنے لئے ہی سمیٹ کر رکھ لینا چاہتا ہے۔ اس ذہنیت اور اس روش سے انسان صرف نظامِ صلوٰۃ کی رو سے رک سکتا ہے۔ یہ آیت درحقیقت سورۂ معارج کی ان آیات ہی کی تفسیر ہے (جو پہلے گذر چکی ہیں اور جن میں کہا گیا ہے کہ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا۔ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا۔ إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (۷۰/۱۹-۲۳) اور اپنی تصریحات سے یہ حقیقت بھی تمہارے سامنے آگئی کہ دین کی تکذیب کون کرتا ہے؟ دین کی تکذیب وہ کرتا ہے۔ جو (سورۂ ماعون کے الفاظ میں)

یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور مسکین کے کھانے کا انتظام نہیں کراتا۔ سو ایسے مصلّین کے لئے تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ جو نماز کے ظاہر ارکان و اجزا ہی کو حقیقی صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور عملاً ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ رزق کے ان سرچشموں کو جو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں، اپنے لئے روک رکھتے ہیں۔

یوم الدین

ممکن ہے بعض لوگ اس پر اصرار کریں کہ "یوم الدین" کا ترجمہ "جزا و سزا کا دن" ہی کرنا چاہیئے۔ لیکن جو حقیقت پچھلے صفحات میں سامنے آچکی ہے۔ اس پر اس ترجمہ سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "جزا و سزا کا دن" کے معنی ہوں گے "خدا کا قانون مکافات" اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ اٹل قانون بنا دیا ہے کہ ہر انسانی عمل۔ ہر روشِ زندگی ایک خاص نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ خدا کی متعین کردہ روش کا نتیجہ زندگی کی آسودگیاں اور خوش حالیاں ہیں۔ اس کے خلاف چلنے کا انجام تباہی اور بربادی ہے۔ جو شخص ذاتی مفاد پرستی کی روش اختیار کرتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی نہیں ہوگا۔ وہ خدا کے قانون مکافات کی تکذیب کرتا ہے۔ وہ عملاً یہ کہتا ہے کہ نہیں! یہ غلط ہے کہ اس روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ یہ ہے وہ شخص جو تکذیب دین یا تکذیب یوم الدین کرتا ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ جو قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی۔ جو اس قسم کا معاشی نظام قائم کرے گی وہ دنیا میں باقی نہیں رہ سکے گی وہ ہٹ جائے گی اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیگی۔ جس کا تصورِ حیات اس پہلی قوم سے مختلف ہوگا اور وہ ان جیسا معاشی نظام قائم نہیں کریگی۔ سورہ محمد میں ہے هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ تم وہ ہو کہ تمہیں اس کی دعوت دی جاتی ہے کہ تم اپنے مال و دولت کو انسانی فلاح و بہبود کیلئے کھلا رکھو فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ۔ سو تم میں وہ لوگ ہیں جو اس روش کو اختیار کرنے کی بجائے بخل کی روش اختیار کر لیتے ہیں جس میں انسان سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر دوسروں کو اس سے محروم رکھنا چاہتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ مَن يَبْخَلُ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ جو دوسروں کو محروم رکھتا ہے۔ وہ درحقیقت خود اپنی ذات کو نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ اس سے خود اس کا نقصان ہوتا ہے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لئے کہ وَاللَّهُ غَنِيٌّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ اللہ کسی کا محتاج نہیں اور تم اپنی نشوونما کے لئے اس کے محتاج ہو۔ یاد رکھو وَإِن تَتَوَلَّوْا اگر تم سیدھے راستے سے پھر گئے اور اس سے گریز کی راہیں تراشنی شروع کر دیں تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (۴۷/۳۸) اس کا قانون مکافات تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہاری جیسی نہیں ہوگی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے اور جو سمجھتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا سرمایہ داری کا نظام قائم دائم رہ سکتا ہے۔ اور اس غلط روش کے نتائج و عواقب کو نمازیں پڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ وہ

تکذیبِ دین

کرتا ہے۔ وہ خدا کے قانونِ مکافات کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے خدا نے قوموں کے عروج و زوال اور بقا اور فنا کے لئے جو قانون مقرر کر رکھا ہے وہ کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہو سکتا۔ (اس قانون کی مزید تشریح کسی دوسرے خط میں کی جائے گی)

والسلام

پرویز

ستمبر ۱۹۵۶ء

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراجِ انسانیت از پرویز — سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے تقریباً ۸۰۰ صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط حسین جلد مع گردپوش قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم از پرویز — سلسلہ معارف القرآن کی پہلی جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصہ آدم و جنات ملائکہ وحی جیسے اہم مباحث کی حامل بڑی تقطیع کے ۳۷۰ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

جوئے نور از پرویز — سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی جو حضرات انبیائے کرام کے تذکار جلیلہ پر مشتمل ہے۔ جس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک تمام انبیائے کرام علیہم التحیۃ والسلام کا تذکرہ آگیا ہے۔
سائز ۲۲×۲۹/۸ ضخامت ۳۰۴ صفحات۔ قیمت مجلد گردپوش چھ روپے۔

انسان نے کیا سوچا؟ از پرویز — فکر انسانی کی آج تک کی تاریخ کہ اس نے اپنی مشکلات و مسائل کو حل کرنے کے لئے آج تک کیا سوچا؟ محترم پرویز صاحب کی بلند پایہ تصنیف۔ سائز ۲۲×۲۹/۸
ضخامت ۳۶۰ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش۔ دس روپے

سلیم کے نام از پرویز — نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ اور مدلل جواب بڑے سائز کے ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چھ روپے۔

فردوسِ گم گشتہ از پرویز — ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۴۱۶ صفحات بڑا سائز۔ قیمت چھ روپے

نظامِ ربوبیت از پرویز — انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:- **ناظم ادارہ طلوعِ اسلام** ۱۵۹/۳۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

لاکھوں کی پسند

ٹریٹ بلیڈ

آپ بھی اِس سے
شیو کا لُطف اٹھایئے

ٹریٹ بلیڈ

اب پانچ اور دس بلیڈ کے پیکٹوں میں خرید سیئے

اچھی عادت بڑی دولت ہے

کیا آپ وقت کے پابند ہیں ؟

وقت زندگی کے برابر عزیز ہے۔ ہم اسے بہتر سے بہتر طور پر کیوں نہ گزاریں ؟ وقت تھوڑا بھی ہو تو وقت کی پابندی اسے دراز کر سکتی ہے۔ اوقات بندھے ہوئے ہوں اور انکا سختی سے لحاظ کیا جائے تو ہر منٹ سے پورا پورا فائدہ حاصل ہو اور آرام و تفریح کے لئے بھی زیادہ وقت بچ رہے۔

کیا آپ پابندی سے روپیہ بھی بچاتے ہیں ؟

وقت کی پابندی سے وقت کی بچت ہوتی ہے، اور خرچ میں کفایت سے روپے کی۔ آپ پابندی کے ساتھ روپیہ بچا کر بچت کے تمسکات خریدتے رہیں تو اپنے روپے پر بہترین منافع حاصل کر سکتے ہیں۔ بچت آپ کی آئندہ مسرتوں اور خوشحالی کی ضامن ہوگی اور آپ کے ملک کو پھلنے پھولنے میں مدد دے گی جس میں ہم سب کی بھلائی ہے

روپیہ بچانے کا یہی وقت ہے
خرچ کرنے کے اور بھی مواقع آئیں گے

پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ میں روپیہ لگایئے

بے حد منافع۔ ڈاک خانوں سیونگ بیورو اور مقررہ ایجنٹوں سے مل سکتے ہیں

A.F.P - 23/56 (II) UNI 654

طاہرہ کے نام

(ہمارے گھر جہنم کیوں بنے رہتے ہیں!)

تمہارا سوال طاہرہ بیٹی! اپنی جگہ بالکل مناسب اور معقول ہے۔ ہمارے لئے یہ سوال ہمیشہ وجہ کاوش بنا رہتا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں، وہ غیر مسلموں کے مقابلے میں غریب ہیں اور بدحال بھی۔ پست بھی ہیں اور کمزور بھی۔ ذلیل بھی ہیں اور محتاج بھی۔ تمہاری نگاہ اس طرف گئی ہے (اور اسے اس طرف جانا بھی چاہیئے تھا) کہ ہمارے گھروں میں عام طور پر نہ اطمینان ہوتا ہے نہ سکون۔ نہ اتفاق ہوتا ہے نہ یگانگت۔ نہ ہم آہنگی ہوتی ہے نہ یک جہتی۔ نہ میاں بیوی میں محبت ہوتی ہے نہ مودت۔ نہ باہمی اعتماد ہوتا ہے نہ بھروسہ غرضیکہ ہمارا گھر نہیں ایک جہنم ہوتا ہے۔ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوتے ہیں۔ تم پوچھتی ہو (اور ایسا پوچھنے میں حق بجانب ہو) کہ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ بھی عزیزہ! وہی ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کی پستی اور زبوں حالی کی ہے!

اجتماعی اور انفرادی زندگی

اجتماعی اور انفرادی زندگی درحقیقت ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اور تمدن معاشرت معیشت، سیاست اور دوسری طرف دوستی کے تعلقات اور گھروں کے اندر کی زندگی سب ان شاخوں کے برگ و بار۔ اگر درخت تندرست و توانا ہے تو اس کی ہر شاخ سرسبز و شاداب ہوگی۔ اور اگر اس کی اصل اور جڑ ہی کرم خوردہ ہو چکی ہے تو اس کے پتے اور ٹہنیاں کسی طرح بھی ہری بھری نہیں رہ سکتیں۔ جس طرح یہ ناممکن ہے کہ درخت کی جڑ اور تنا صحیح و سالم ہو۔ لیکن اس کی شاخیں اور پتے خشک اور پژمردہ۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ درخت کی جڑیں تو خشک ہو چکی ہوں اور اس کی ٹہنیاں لہلہاتی دکھائی دیں۔ جہاں تک ہماری اجتماعی زندگی کا تعلق ہے۔ میں اس حقیقت کی بار بار وضاحت کر چکا ہوں (اور اسباب زوال امت" میں تم اسے اچھی طرح دیکھ چکی ہو) کہ اس کی بنیادی وجہ وہ غلط مذہب ہے جسے ہم نے دین خداوندی کی جگہ اختیار کر رکھا ہے۔ باقی رہی ہماری گھروں کی زندگی، سو اسے بھی جہنم زار بنانے کا سبب ہماری وہ خود ساختہ شریعت ہے جس میں ہم نے اپنے آپ کو چاروں طرف سے جکڑ رکھا ہے۔ مسلمان مذہب پرست قوم ہے۔ اور مذہب پرست قوم کی دنیا میں عجیب حالت ہوتی ہے۔

مذہب اور دین

مذہب کے معنی یہ ہیں کہ ہم بعض باتوں کو ابدی صداقتیں (یعنی ہمیشہ رہنے والی سچائیاں) مانیں اور انہیں غیر متبدل سمجھیں۔ بھلے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے پراٹل رہیں۔ اگر یہ

باتیں وہ اصول ہوں جنھیں خدا نے تمام انسانوں کی راہ نمائی کے لئے عطا کیا ہے تو ان اصولوں پر کاربند رہنے اور انھیں ناقابل تغیر و تبدل سمجھنے سے اس قوم کی اپنی زندگی بھی عزت و سرفرازی اور خوش بختی و مرفہ الحالی کی زندگی ہو جاتی ہے۔ اور جن قوموں کا اس سے واسطہ پڑتا ہے وہ بھی امن و سکون میں رہتی ہیں۔ اس قوم کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ دین خداوندی کی متبع ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم ان باتوں کو غیر متبدل سمجھ لے جو کسی زمانے میں انسانوں نے وضع کی تھیں، تو اس کی اپنی زندگی بھی جہنم بن جائے گی اور وہ دوسروں کی نگاہوں میں بھی ذلیل و خوار ہو جائے گی۔ اس قوم کو "مذہب" کی پابند کہا جائے گا۔ ہم نے دین خداوندی کو چھوڑ کر مذہب کی پابندی اختیار کر رکھی ہے۔ جس کا نتیجہ وہی کچھ ہونا چاہیئے تھا جو ہو رہا ہے۔ یہ بات نہ غیر فطری ہے نہ غیر معمولی۔ نہ اچنبھے کی بات ہے نہ تعجب کی۔ اچنبھا تب ہوتا اگر اس کے ایسے نتیجے نہ نکلتے۔ ببول کا بیج بونے سے اگر کانٹے دار کیکر کا درخت اگ آئے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ تعجب تو اس صورت میں ہوتا کہ اگر اس میں انگور لگنے شروع ہو جاتے۔ آؤ اب میں تمہیں بتاؤں کہ جو کچھ تم نے پوچھا ہے اس سلسلہ میں دین اور مذہب میں کیا فرق ہے۔ اور دین کو چھوڑ کر مذہب پرستی نے کس طرح ہمارے گھروں کو جہنم بنا رکھا ہے۔

سب سے پہلے تم نے ارشد کے گھر کی مثال دی ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہاں کس قدر عدم سکون کی حالت ہے گھر میں ایک چولہا ہے جس میں گیلی لکڑیاں سلگ رہی ہوں۔ اور دھوئیں سے ہر ایک کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس کی وجہ تمہیں معلوم ہے؟ ارشد

بچپن کی شادیاں

کی شادی اس وقت ہو گئی تھی۔ جب وہ ابھی ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر بمشکل بارہ تیرہ برس کی ہو گی اور صغیرہ کی نو دس برس کی۔ صغیرہ اس کی خالہ کی لڑکی ہے اور یہ رشتہ دونوں بہنوں (یعنی ان دونوں کی ماؤں) نے اپنی مرضی سے کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عمر میں نہ ارشد کے انتخاب کا سوال پیدا ہو سکتا تھا، نہ صغیرہ کی مرضی کا۔ ارشد اس کے بعد گاؤں سے شہر آ گیا۔ اس نے ایم اے کیا۔ مقابلہ کا امتحان پاس کیا۔ ولایت گیا۔ واپسی پر آتے ہی بطور اسسٹنٹ کمشنر تعینات ہو گیا۔ لیکن صغیرہ وہی دہقانی لڑکی رہی اب تم بتاؤ کہ یہ جوڑ (جسے جوڑ کہنا ہی غلط ہے) نبھتا کس طرح؟ سوال یہ ہے کہ ایسا ہوا کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے ہاں شادیاں مروجہ "شریعت" کے تابع ہوتی ہیں۔ اور اس شریعت کا فیصلہ ہے کہ دس بارہ برس تو ایک طرف دس بارہ مہینے کے بچے اور بچی کی شادی بھی بالکل جائز اور درست ہے۔ اس لئے جس بات کو شریعت نے جائز قرار دے دیا ہو۔ اس میں مداخلت کا حق کسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کے برعکس دین کا فیصلہ یہ ہے کہ نکاح کی عمر ہی بلوغت کی عمر ہے۔ یعنی بالغ ہونے سے پہلے لڑکی اور لڑکے کی شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر اس نے کہا ہے کہ صرف بلوغت ہی شرط نہیں بلکہ نکاح ایک معاہدہ ہے۔ جس میں فریقین کی رضا و رغبت نہایت ضروری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب یہ معاہدہ انتخاب اور رضامندی سے ہو گا تو فریقین ایک دوسرے کے مزاج۔ افتاد طبیعت۔ تعلیم۔ تربیت۔ ماحول۔ عادات و خصائل۔ ہر بات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں گے۔ اگر ہماری خود ساختہ شریعت ہمارے لئے سند نہ بنتی تو ارشد صغیرہ کی شادی دس بارہ برس کی عمر میں ہو ہی نہ سکتی۔ جب یہ بڑے ہو جاتے تو ارشد اپنی شادی اپنے معیار کے مطابق کرتا۔ اور صغیرہ کی شادی

اس کے ماحول کے مطابق کسی اور جگہ ہوتی۔ ان شادیوں میں باہمی مطابقت اور ہم آہنگی کے امکانات بہت زیادہ ہوتے۔

سمجھیں تم کہ مذہب (دین) کے فرق نے اس معاملہ میں کتنا بڑا فرق پیدا کر دیا؟ اب دوسری مثال سامنے لاؤ۔ ہمایوں اور رفعت کے گھر کی زندگی کس قدر قابل رشک تھی؟ وہ دونوں سکون اور طمانیت کی فضاؤں میں مسرت کے جھولے جھولتے تھے لیکن جب ہمایوں ولایت گیا ہے تو تم نے دیکھا کہ رفعت کس قدر مغموم اور افسردہ خاطر رہنے لگی تھی؟ رفعت کو ہمایوں کے کیریکٹر پر شبہ نہیں تھا۔ اسے اس کی پاکبازی کا پورا پورا یقین تھا۔ لیکن اسے یہ خیال مسلسل ستا رہا تھا کہ اگر وہ تنے دقت وہاں سے ایک اور بیوی ساتھ لے آیا تو کیا ہوگا؟

دوسری بیوی

رفعت کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا؟ اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ ہماری شریعت نے مرد کو اس کا حق دے رکھا ہے کہ جب بھی چاہے دوسری (تیسری بلکہ چوتھی) بیوی کر سکتا ہے۔ اور اس کا یہ فعل نہ معاشرے کی نگاہوں میں مذموم ہوتا ہے۔ نہ اخلاق کی بارگاہ میں معیوب۔ یہ تھا وہ خیال جو رفعت کو بار بار ستا رہا تھا اور وہ (اندر ہی) اندر گھلی جا رہی تھی۔ دو ایک سہیلیوں کے اصرار پر اس نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کر دیا۔ یہ بھی کوئی معیوب بات نہ تھی۔ ان میں سے ایک نے ازراہ ہمدردی ہمایوں کو لکھ دیا کہ دیکھنا! وہاں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ رفعت جیتے جی مر جائے گی۔ وہ واپس آیا تو غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا تو آگ بگولا ہو کر کہنے لگا کہ چچا جان! رفعت نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔ اس نے میرے متعلق اس قسم کی بدظنی سے کام کیوں لیا؟ اسے اس قسم کا واہمہ پیدا کیوں ہوا؟ کیا اس دس برس کی رفاقت سے اس نے میرے کیریکٹر کے متعلق یہی اندازہ لگایا تھا؟ اس نے میری عزت خاک میں ملا دی ہے۔ اس نے مجھے بد اعتماد ثابت کیا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ بڑے تحمل سے سنا اور بات کو کسی اور طرف ٹال کر اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

تمہیں معلوم ہے کہ ہمایوں شراب کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتا اور سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ اس واقعہ کے دو ہی تین دن بعد کا ذکر ہے۔ وہ ہمارے پاس بیٹھا تھا۔ ہم نے سگریٹ کیس نکالا۔ ایک سگریٹ خود لیا۔ اور یونہی مسکراتے ہوئے سگریٹ کیس ہمایوں کی طرف بڑھا دیا۔ ہمایوں نے بھی مسکراتے ہوئے ایک سگریٹ نکال لیا۔ اور دونوں نے اپنے اپنے سگریٹ سلگا لئے۔ حلقے کے جانے کے بعد میں نے ہمایوں سے کہا کہ میاں! تم تو بڑے پختہ کیریکٹر کے نوجوان ہو۔ شریعت کے بھی بہت پابند ہو۔ تم نے آج سگریٹ لے کر کتنے بودے پن کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ چچا جان! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ سگریٹ پینا نہ از روئے شریعت حرام ہے نہ اخلاقی نکتہ خیال سے معیوب۔ میں اگر سگریٹ نہیں پیتا تو اس لئے کہ مجھے اس کی عادت نہیں نہ اس لئے کہ میں اسے شراب کی طرح حرام سمجھتا ہوں۔ اس لئے اگر میں نے یونہی سگریٹ اٹھا لیا (بلکہ یوں سمجھئے کہ اگر میں اب باقاعدہ سگریٹ پینے بھی لگ جاؤں) تو اس سے میرے کیریکٹر پر کون سا حرف آ سکتا ہے۔ آپ نے تو چچا جان! آج عجیب سی بات کہہ دی ہے۔ آپ تو ایسی باتیں نہیں کیا کرتے تھے! میں نے آہستہ سے کہا کہ بیٹا! اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ میں ایک بات سمجھنا چاہتا تھا سو میں نے اسے سمجھ لیا ہے۔ تم نے جو کچھ کہا ہے۔ اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ جس بات کو شریعت نے

ناجائز نہ قرار دیا ہو۔ اور نہ ہی وہ بات، معاشرہ یا اخلاق کی رو سے معیوب سمجھی جاتی ہو۔ اگر تمہارا کسی وقت جی چاہے تو اسے کر لینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہوتا۔ تمہارے نزدیک اس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہوتی ہے نہ جرم کی۔ نہ شرم کی نہ جھجک کی۔ اس نے کہا کہ بالکل میں یہی سمجھتا ہوں۔ اس پر میں نے کہا کہ بیٹا! شریعت نے (یعنی اس شریعت نے جو ہمارے ہاں اس وقت مروج ہے) ایک مرد کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ جب جی چاہے دوسری شادی کر لے۔ اس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہوتی ہے نہ جرم کی۔ نہ ہی اسے معاشرہ یا اخلاق باعث شرم قرار دیتا ہے یا موجب ندامت۔ تم اسی شریعت کے پابند ہو۔ اگر تمہارے متعلق میں یہ خیال کروں کہ تم جب جی چاہے دوسری شادی کر لو گے تو کہو کہ میں نے اس سے تمہارے کیریکٹر اور اخلاق پر کون سا حملہ کر دیا!

ہمایوں بڑا سمجھدار ہے اور سعادت مند بھی۔ یہ سنکر اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ ہتھیلی پر سر رکھ لیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا کچھ وقفہ کے بعد اس نے سر اٹھایا اور کچھ گلہ مندانہ انداز سے کہا کہ چچا جان! یہ بتائیے کہ رفعت نے میرے متعلق اس قسم کی بدظنی سے کام کیوں لیا۔ مجھے اس کا صدمہ ہے! میں نے کہا کہ بیٹا! اس میں رفعت کا کوئی قصور نہیں۔ ہمارے ہاں کی ہر عورت اسی قسم کی بندش میں رہتی ہے۔ اسے ہر وقت اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم میاں کس وقت کسی اور بیوی کو انگلی سے پکڑ کر ساتھ لے آئے۔ یہ دھڑکا عام حالات میں تو دبا رہتا ہے۔ لیکن اگر کبھی میاں ایسے ماحول میں چلا جائے۔ جہاں اس بات کے امکانات زیادہ ہوں (جیسا کہ تمہارے قصے میں ہوا کہ تم ولایت چلے گئے) تو یہ اندیشہ ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس سے عورت کو کچھ تو اپنی بے بسی کا احساس ستاتا ہے۔ لیکن بے بسی سے کہیں زیادہ شدید جذبہ رقابت کا ہوتا ہے۔ ہر عفت مآب عورت کی طرح، ایک وفا شعار بیوی کی اپنے خاوند کے معاملہ میں ہمیشہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

عشق است و ہزار بدگمانی باسایہ ترا نمی پسندم

یہ ہیں وہ جذبات جن کے تابع عورت کے دماغ پر وہ خیالات طاری ہو جاتے ہیں، جنہیں ہم "مرد" بدگمانی اور بدظنی۔ عدم اعتماد اور کیریکٹر کے فقدان پر محمول کر کے خفا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں ذرا اپنے آپ کو عورت کی پوزیشن میں رکھ کر اندازہ لگانا چاہیئے کہ ایسے حالات میں، ہمارے دل و دماغ کی کیفیت کیا ہو جائے گی؟

ہمایوں یہ سب کچھ بڑی خاموشی سے سنتا رہا۔ بالآخر اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ "رفعت! مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی" میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

تم نے غور کیا طاہرہ! کہ ہماری اس خود ساختہ شریعت نے میاں بیوی کے باہمی اعتماد کو چھین کر ہمارے گھروں کو کس طرح جہنم بنا رکھا ہے؟ لیکن خدا کے دین نے یہ کچھ نہیں کیا اس نے مرد کو کہیں اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ جب جی چاہے دوسری بیوی لے آئے۔ قطعاً نہیں۔ ذرا سوچو کہ اگر ہم مروجہ مذہب کے پابند ہونے کے بجائے خدا کے دین کے پابند ہوتے تو ہماری زندگی باہمی بدگمانیوں کا جہنم بننے کے بجائے کس طرح اعتماد اور یقین کی جنت ہوتی۔ یاد رکھو بدگمانی (وہ میاں کے دل میں ہو یا بیوی کے) اور اس کی وجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، وہ پھانس ہے جس کی چبھن انسان کو ایک لمحہ کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ خدا کے دین نے اس پھانس

کو نکال کر رکھ دیا تھا۔ لیکن ہم نے اس دین کو چھوڑ کر نہ معلوم کیسی کیسی زہر آلود پھانسیں اپنے دلوں میں چبھو رکھی ہیں اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے

بہن خدیجہ کے متعلق تم نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا میں نے اس کی بابت خود اسی سے پوچھا تھا۔ مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ خدیجہ بڑی نیک عورت ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ اپنے گھر کے پیسوں میں چوری کر کے کچھ رقم الگ رکھ لیتی ہو۔ چنانچہ اس نے جو کچھ بتایا اس سے میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ بات کچھ اور ہے۔ اور وہ بات بھی عزیزہ! انہی باتوں جیسی ہے۔ جنھیں میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس نے میرے پوچھنے پر کہا کہ بھائی صاحب! آپ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ صغریٰ کے ابا کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ وہ بات بات پر تڑاق سے کہہ دیتے ہیں کہ میں تمہیں طلاق دیدوں گا۔ تم بچوں کو لے کر جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔

طلاق

پہلے تو میں اسے محض طبیعت کی تیزی سمجھا کرتی تھی لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ وہ یہ بات دل سے کہتے ہیں۔ اب مجھے یہ خطرہ ستانے لگا ہے کہ اگر انھوں نے کسی دن سچ مچ طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ دیا تو میں کیا کروں گی؟ اور پھر ان بچوں کا کیا بنے گا؟ میری کوئی جائداد نہیں۔ کوئی پرسانِ حال نہیں۔ میں نے اس ڈر کے مارے اب یہ کیا ہے کہ گھر کے خرچ سے جس قدر بچا سکتی ہوں بچاتی ہوں۔ اور اسے (انھیں خبر کئے بغیر) الگ رکھتی جاتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس سے کوئی خاطر خواہ رقم اکٹھی نہیں ہو جائے گی۔ لیکن بہر حال ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ایسے منحوس وقت میں چند دنوں تک کے لئے بچوں کے پیٹ پالنے کا آسرا تو ہو جائے گا۔ میں خود اللہ سے ڈرتی ہوں کہ کہیں اس کا شمار خیانت میں نہ کر لیا جائے۔ اس کے لئے میں نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا ہے کہ (خدا بری ساعت سے بچائے) اگر کہیں وہ روز بد دیکھنا پڑ گیا تو انہیں کہہ دوں گی کہ آپ کی کمائی سے اتنے پیسے میرے پاس جمع ہیں آپ انھیں میرے مہر سے وضع کر لیں۔ کیا معلوم یہ بقایا مہر بھی دیں یا نہ دیں۔ لیکن میں تو خدا سے سرخرو ہو جاؤں گی۔

تم نے دیکھا طاہرہ! کہ بہن خدیجہ جیسی نیک طینت عورت کو کس خطرہ نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا؟ اور اس کے بعد یہ بھی سوچو کہ جس عورت کو اپنے مستقبل کے متعلق اس قسم کا دھڑکا لگا ہے وہ خاک سکون کی زندگی بسر کر سکتی ہے؟ اور جن میاں بیوی میں باہمی اعتماد کا یہ عالم ہو ان کے گھر میں سکھ اور چین کہاں سے آ سکتا ہے؟ یہ بات صرف خدیجہ سے ہی مخصوص نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں ہر بیوی کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ

اب چھری صیاد نے لی، اب قفس کا در کھلا

اس لئے کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی رو سے مرد کو اس کا پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جب جی چاہے بغیر کوئی وجہ بتائے ایک دو تین کہہ کے بیوی کو الگ کر سکتا ہے۔ تم سوچو عزیزہ! کہ جس معاشرہ میں عورت کے سر پر ہر وقت یہ تلوار لٹکتی ہے۔ اس معاشرہ میں گھروں کی زندگی جہنم نہ بنے تو اور کیا ہو۔

تم کہہ دو گی کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے تو خود اسلام پر سخت اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ کیونکہ اسلام نے ان باتوں کو

جائز قرار دیا ہے۔ اس لئے اگر ان باتوں کا نتیجہ معاشرہ کی تباہی اور گھروں کی زندگی کا جہنم ہے تو اس کی ذمہ داری مردوں پر عائد نہیں ہوتی خود اسلام پر عائد ہوتی ہے۔ جس نے مردوں کو اس قسم کے اختیارات دے رکھے ہیں۔

اسلام پر اعتراض نہیں

اگر اسلام نے فی الواقعہ اس قسم کے اختیارات مردوں کو دے رکھے ہوتے تو تمہارا اعتراض بالکل صحیح ہوتا۔ لیکن جیسا کہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں، اسلام نے مردوں کو اس قسم کے اختیارات بالکل نہیں دیئے۔ یہ اختیارات اس شریعت نے دے رکھے ہیں جو بعد کی پیداوار ہے۔ قرآن ان کی اجازت کبھی نہیں دیتا۔ قرآن صغر سنی کی شادی کی اجازت نہیں دیتا اس نے نکاح کے لئے بلوغت کی عمر کو ضروری قرار دیا ہے۔ وہ لڑکے یا لڑکی کی رضامندی کے بغیر نکاح کو جائز نہیں قرار دیتا اس کے نزدیک نکاح ایک معاہدہ ہے۔ جس کے لئے فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔ وہ کسی مرد کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ جب جی چاہے دو تین چار تک شادیاں کرے۔ وہ تعدد ازدواج کو معاشرہ کی ایک ہنگامی مشکل کے حل کے لئے تجویز کرتا ہے۔ جس کا فیصلہ مسلمانوں کا اجتماعی نظام کر سکتا ہے نہ کہ افراد۔ وہ مرد کو اس کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ وہ جب جی چاہے عورت کو طلاق دیکر الگ کر دے اس نے معاہدۂ نکاح کی تنسیخ کے لئے ایک متعین طریق کار تجویز کیا ہے۔ جس کی سلسلہ جنبانی کا حق مرد اور عورت دونوں کو حاصل ہے۔ لیکن جس کا فیصلہ عدالت کی رو سے ہو سکتا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ جس اسلام کے یہ احکام ہوں۔ اس پر وہ اعتراض کسی طرح بھی وارد ہو سکتا ہے۔ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے؟

ہمارے صدر اول کی تاریخ

تم کہو گے کہ مولوی صاحبان اپنی شریعت کی تائید میں رسول اللہؐ اور صحابہؓ کے عہد کے واقعات پیش کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام وہی ہیں جنہیں وہ بیان کرتے ہیں۔ اس بات کے متعلق میں پہلے بھی (ایک خط میں) لکھ چکا ہوں کہ ہمیں اپنے عہد اول کی تاریخ کا مطالعہ کسی اصول کے ماتحت کرنا چاہیئے۔ یہ بات واضح ہے کہ

(۱) نبی اکرمؐ کی زندگی قرآن کے مطابق بسر ہوئی تھی

(۲) قرآن کا ایک ایک لفظ ہمارے پاس محفوظ ہے

(۳) نبی اکرمؐ کے زمانے کی تاریخ صدیوں بعد جا کر مرتب ہوئی۔

ان حالات میں یہ واضح اصول ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے متعلق جو کچھ ہمیں تاریخ میں ملتا ہے۔ اس میں وہی کچھ یقینی طور پر صحیح ہو سکتا ہے جو قرآن کے خلاف نہ جائے۔ اگر اس میں کوئی بات ایسی ملتی ہے جو قرآن کے خلاف ہے تو ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ وہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ رسول اللہؐ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسے امور کے متعلق یا تو ہمیں مزید تحقیق کرنی چاہیئے اور اگر اس کا کوئی امکان نہ ہو تو پھر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ واقعہ یا تو قرآن کے حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور یا بالکل غلط ہے۔ مثلاً (صغر سنی کی شادی کے سلسلہ میں) کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ کا حضرت عائشہؓ سے نکاح اس وقت ہوا جب حضرت عائشہؓ کی عمر چھ برس کی تھی۔ لیکن بعض واقعات کی تطبیق سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ بات غلط ہے حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے

وقت کم از کم پندرہ سولہ برس کی تھی۔ اسی طرح حضورؐ کی ازواج مطہرات کے متعلق صورت یہ ہے کہ ایک تحقیق کے مطابق یہ تمام شادیاں قرآن کے حکم سے پہلے ہو چکی تھیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں سے کوئی شادی بھی ان وجوہات کی بنا پر نہیں ہوئی تھی جو وجوہات دوسری شادی کے لئے ہم پیش کرتے ہیں (مثلاً پہلی بیوی کے اولاد نہ تھی۔ یا وہ بیمار رہتی تھی وغیرہ)

جہاں تک طلاق کا تعلق ہے میں بعض سابقہ خطوط میں یہ بتا چکا ہوں کہ قرآن کی رو سے اس کا طریقہ کیا ہے۔ اس طریقہ کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ البتہ اس کے اس حصہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ جس میں تین طلاق کا ذکر ہے۔ قرآن کی رو سے تین طلاق کے معنی یہ ہیں کہ جب (تمام ضروری مراحل طے پا چکنے کے بعد) طلاق کا فیصلہ ہو جائے تو میاں بیوی الگ ہو جاتے ہیں۔ اسے پہلی مرتبہ کی طلاق کہتے ہیں۔ اس کے بعد اگر یہ میاں بیوی چاہیں تو پھر سے ازدواجی زندگی بسر کر سکتے ہیں اس طرح میاں بیوی بن جانے کے بعد اگر پھر کبھی طلاق کی نوبت آجائے تو یہ دوسری مرتبہ کی طلاق ہوگی۔ اس کے بعد بھی ان کے دوبارہ میاں بیوی بن جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن اگر تیسری مرتبہ اسی طرح طلاق کی نوبت پہنچ جائے تو اس کے بعد یہ آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔ پھر یہ عورت کسی اور مرد کے ساتھ ہی شادی کر سکتی ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ اس کا یہ نیا خاوند مر جائے۔ یا اس سے اسے طلاق مل جائے تو یہ پھر پہلے خاوند سے نکاح کر لے) یہ ہے قرآن کی رو سے تین طلاق کا مطلب۔

اب اس سلسلہ میں روایات کو دیکھو۔ بعض روایات اس قسم کی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تین طلاق سے مطلب ہے ایک ایک ماہ کے وقفے کے بعد تین مہینوں میں تین طلاقیں پوری کرنا اور ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ ایک ہی نشست میں تین بار طلاق کہہ دینے سے تینوں طلاقیں پوری ہو جاتی ہے۔ ان کے ساتھ یہ بھی روایت ہمارے سامنے آتی ہے کہ

> حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو ایک طلاق نبی اکرمؐ کے زمانے میں دی جس کے بعد حضورؐ نے ان کی بیوی کو ان کی طرف لوٹا دیا۔ پھر انھوں نے دوسری طلاق حضرت عمرؓ کی خلافت میں دی۔ اور تیسری طلاق حضرت عثمانؓ کے عہد میں۔
>
> (مشکوٰۃ۔ باب خلع وطلاق۔ بحوالہ ابوداؤد و ترمذی۔ ابن ماجہ۔ دارمی)

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت رکانہؓ نے پہلی مرتبہ کی طلاق نبی اکرمؐ کے زمانہ میں دی جس کے بعد ان کے میاں بیوی کے تعلقات پھر استوار ہو گئے۔ پھر دوبارہ طلاق کی نوبت حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آئی۔ اس کے بعد ان کے ازدواجی تعلقات پھر استوار ہو گئے۔ پھر تیسری مرتبہ یہی صورت حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں پیدا ہو گئی۔ یہ تیسری طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت رکانہؓ کی بیوی ان سے نکاح نہیں کر سکتی تھی۔ چونکہ تین طلاق کا یہ طریق قرآنی طریق کے مطابق ہے۔ اس لئے ہم باور کر سکتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے۔

تم نے غور کیا طاہرہ! کہ روایات کے صحیح یا غلط تسلیم کرنے کا قرآنی معیار کیا ہے۔ ہمیں اس معیار کے مطابق تمام تاریخی واقعات کو پرکھنا چاہیئے۔ اور صرف انہی واقعات کو صحیح تسلیم کرنا چاہیئے جو قرآن کے مطابق ہوں۔ اس اصول کے ماتحت نکاح وطلاق کے بارے میں جو کچھ مروجہ مذہب کی رو سے ہو رہا ہے اور وہ قرآن کے خلاف ہے۔ اس کی نسبت نبی اکرمؐ کی طرف کبھی

نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ سب بعد کا وضع کردہ ہے۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ اس بعد کے وضع شدہ مذہب کی جگہ وہ دین لے لے جسے خدا نے قرآن میں نازل کیا تھا۔ اور جس کے مطابق نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کبارؓ نے عمل کیا تھا۔ اس دین میں وہ اُلجھنیں کبھی پیدا نہیں ہو سکتیں جن کا جگر خراش تذکرہ مذکورہ صدر واقعات میں سامنے آیا ہے۔

ماڈرن گھروں کی حالت

یہ حالت ہمارے پرانے فیشن کے گھروں کی ہے۔ جہاں تک ماڈرن فیشن کے گھروں کا تعلق ہے، ان کی حالت ان سے بھی بدتر ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ قدامت پرست گھروں کی آگ تپِ دق کی آتشِ خاموش کی طرح گھر کے امن و سکون کو اندر اندر جلا کر راکھ بنا دیتی ہے۔ اور ان ماڈرن گھروں کی یہ آگ سرسام کے شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک کر تماشا دکھاتی ہے۔ یہ ماڈرن گھر مغرب کی اندھی تقلید کے نمونے ہیں۔ مغرب میں ہوا یہ کہ وہاں (ہماری خود ساختہ شریعت کی طرح) عیسائیت نے عورت پر جو استبداد صدیوں سے روا رکھا تھا، اس کے ردِّعمل میں عورت کے دل میں انتقام کے ایسے شعلے بھڑک اٹھے کہ وہ یکسر بغاوت اور بیباکی کا مجسمہ بن گئی۔ ہماری عورتوں نے اسی کو تہذیب سمجھا اور ان کی دیکھا دیکھی انھوں نے بھی اسی قسم کی روش اختیار کر لی۔ اس روش کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ ازدواجی زندگی کو بالکل ایک کاروباری چیز (BUSINESS CONCERN) سمجھ لیا گیا۔ اس 'کاروبار' میں میاں بیوی کی ازدواجی زندگی بالکل اسی قسم کی ہوتی ہے جیسے کسی دوکان کے دو حصہ دار (PARTNERS) ہوں کہ جب تک انھیں اس اشتراک میں فائدہ نظر آئے ان کا یہ تعلق قائم رہے جب کوئی اور کاروبار زیادہ منفعت بخش دکھائی دے۔ اسے چھوڑ کر اس میں شریک ہو جائے۔ اس شراکت میں شریک غالب بیوی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس نے اس معاہدہ میں ایسی شرائط لکھا رکھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے میاں ہمیشہ دبا رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں ان کی یہ شراکت بالکل حیوانی سطح پر ہوتی ہے۔ جس میں وجہ جامعیت جنسی جذبات اور زندگی کے طبعی تقاضوں سے بلند کوئی نہیں ہوتی۔ اور ذرا آگے چل کر یہ تعلق میکانکی (MECHANICAL) سا رہ جاتا ہے جسے محض اس لئے قائم رکھا جاتا ہے کہ یہ سوسائٹی میں میاں بیوی کی حیثیت سے متعارف رہیں۔ ذرا سوچو بیٹی! کہ جس گھر کی دیواریں ان بنیادوں پر استوار ہوں، اس گھر میں سکون اور اطمینان کس طرح داخل ہو سکتا ہے؟ یاد رکھو عزیزہ! گھروں میں حقیقی امن و سکون اور میاں بیوی میں قلبی محبت اور مودّت کا رشتہ اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ ایک طرف ہم ان خود ساختہ زنجیروں کو توڑ دیں جن میں ہم نے اپنی عورتوں کو صدیوں سے جکڑ رکھا ہے۔ اور دوسری طرف ان بیباکیوں کو روکیں جنھیں ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کر لیا ہے۔ اور اس کے بعد اپنے ازدواجی تعلقات کو ان حدود و قیود کے دائرے کے اندر رکھ کر جنھیں قانونِ خداوندی نے متعین کیا ہے۔ حقیقی آزادی کی زندگی بسر کریں۔ تاکہ ہمارے گھر جنتی فضاؤں سے معمور ہو جائیں۔

آخر میں مجھے تم سے ایک بات خصوصیت سے کہنی ہے۔ ہمارے ان گھروں میں جہاں مردوں کی صحیح ذہنیت کے پیشِ نظر

عورت کا جمود

نہ عورتوں کو ہر وقت "طلاق اور سوکن" کا ہوا ستاتا ہے اور نہ ہی عورتوں کی صحیح تربیت کی بنا پر، مرد گھروں میں بھی ہوٹل کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک اور بات پیش آتی ہے جس کی وجہ سے گھر میں پھر وہ سکون نہیں رہتا جو متاہل زندگی کا مقصود ہے۔ اس کی ذمہ دار ہماری نیک دل لیکن سادہ لوح عورتیں ہیں۔ جب عابد اور زاہدہ کی شادی ہوئی ہے تو دونوں کی تعلیم بھی کم و بیش یکساں تھی۔ مزاج میں بھی موافقت تھی۔ طرز بود و ماند بھی قریب قریب ایک ہی جیسا تھا۔ اس لئے اس شادی کے متعلق ہر ایک کو اطمینان تھا کہ یہ جوڑا بالکل ہم آہنگی اور یک رنگی کا آئینہ دار رہے گا کچھ عرصہ تک یہ دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ مسرتوں کے جھولے جھولتے اور خوشگواریوں کی پینگیں بڑھاتے۔ لیکن اس کے بعد ان میں کچھ تفاوت پیدا ہونا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اس تفاوت نے اتنے بُعد کی صورت اختیار کرلی کہ دیکھنے والے کو محسوس تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ دونوں کبھی دوش بدوش چلے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عابد نے اس کے بعد اپنے علم کی وسعت، معلومات کی زیادتی ذوق کی شستگی کے لئے برابر محنت جاری رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن بدن آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن زاہدہ ایک پتھر کے مجسمہ کی طرح وہیں کی وہیں زمین گیر رہی۔ عابد نے بہتیری کوشش کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ چلائے لیکن اس نے اپنی جگہ سے نہ ہلنا تھا نہ ہلی۔ اس میں آگے بڑھنے اور عابد کے ساتھ چلنے کی صلاحیت تھی۔ ضرورت صرف اس کی تھی کہ وہ اس کی اہمیت کا احساس کرے اور اس کے لئے عابد جیسی محنت کرے۔ لیکن زاہدہ کبھی اس کے لئے آمادہ نہ ہوئی اور ہمیشہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دلاتی رہی کہ عابد کو تو خدا نے خاص دل و دماغ عطا کیا ہے ہر کوئی اس جیسا تھوڑا ہو سکتا ہے اور پھر انہیں سوائے اس کے اور کام ہی کیا ہے کہ دن رات لکھنے پڑھنے میں رہیں میرے لئے سو دھندے ہیں یا تو میں بھی سینے پرونے کی تتلی بنکر گھر بار کو نوکروں پر چھوڑ کر ان کے ساتھ کتابوں کا کیڑا بنی رہوں اور یا گھر کو سنبھالوں دونوں میں سے ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ لیکن میں گھر کو ترجیح دیتی ہوں مجھے زیادہ پڑھ لکھ کر کون سا مقابلہ کا امتحان پاس کرنا ہے کہ اچھی ملازمت مل جائے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے یہ محض جھوٹا اطمینان تھا۔ اب اس کے بعد دو ہی صورتیں تھیں یا تو یہ کہ جس طرح ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا ہے عابد بھی آگے بڑھنے سے رک جاتا اور اپنے آپ کو زاہدہ کی زنجیروں کے ساتھ جکڑے رکھتا۔ اور یا وہ اپنی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اس نے یہی کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد وہ اتنا آگے نکل گیا کہ ان دونوں رہروان جادۂ زندگی میں بُعد المشرقین ہو گیا۔ اسے زاہدہ سے محبت تھی اس لئے وہ اسے قدم قدم پر آواز دیتا تھا لیکن زاہدہ اپنے پاؤں کو ذرا بھی جنبش دینے کیلئے تیار نہ تھی۔ اب اس بُعد کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ عابد بڑا نیک طینت تھا۔ اس لئے اس نے باہمی تصادم کی صورت نہ پیدا ہونے دی۔ لیکن باہمی ہم آہنگی سے جو حقیقی مسرت اور سکینت میسر آسکتی تھی وہ تو اسے نصیب نہ ہو سکی۔ وہ زندگی کے خاموش لمحات میں اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا کہ میں کبھی سوچتا ہوں کہ میرا یہ سودا کہ میں زاہدہ کے ساتھ جکڑے رہنے کے بجائے اس طرح آگے بڑھ آیا ہوں، خسارہ کا ہے یا نفع کا لیکن کسی آخری فیصلہ پر نہیں پہنچ پاتا۔ جو کچھ میں نے پایا ہے اس کی قیمت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن جو کچھ میں نے کھویا ہے اس کا پورا پورا احساس بھی کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سودا کیسا رہا! ذرا سوچو بیٹی! اگر زاہدہ کچھ بھی ہمت کرتی تو عابد کی زندگی کیسی ہوتی؟ اور عابد ہی کی نہیں خود زاہدہ کی بھی۔ میں نے یہ آخری بات خاص طور پر اس لئے کہی ہے کہ یہ خود تمہارے لئے بڑی سبق آموز ہے۔ اچھا خدا حافظ۔

ستمبر ۱۹۵۶ء

پرویز

DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
دُورا جلوس
ناخون کی پالش
تزئین حُسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
دُورا جلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی: باب دہم

اس نوجوان کی حکایت جو مرو سے سیّد علی ہجویریؒ کے پاس آیا۔ اور ان سے دشمنوں کے ظلم و ستم کی فریاد کی۔

اس باب میں حضرت علامہ نے ایک نوجوان کی حکایت کے رنگ میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ انسان کو نامساعد حالات کے ماتحت (دشمنوں کے نرغے میں گھر کر) کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ باب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

سیّدِ ہجویر مخدومِ امم
مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم

لاہور میں داتا گنج بخشؒ کا مشہور مزار ہے۔ ان کا نام سید علی تھا اور وہ ہجویر کے رہنے والے تھے۔ پانچویں صدی ہجری میں وفات پائی۔ خواجہ معین الدین اجمیریؒ سنجر کے رہنے والے تھے۔ اس لئے آپ کو سنجری بھی کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ اپنے داتا گنج بخش صاحب کے مزار پر چلہ کشی کی تھی۔ اور یہاں سے پھر اجمیر تشریف لے گئے تھے۔ مندرجہ بالا شعر میں سید علی ہجویریؒ کا تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا ہے کہ یہ وہ بزرگ تھے جن کے مزار پر خواجہ اجمیریؒ جیسے بزرگ تشریف لائے تھے۔

ہند ہائے کوہسار آساں گسیخت
در زمینِ ہند تخمِ سجدہ ریخت

وہ غزنہ (اپنے وطنِ مالوف) سے چلے۔ راستہ میں بڑے بڑے پہاڑ ان کے سدِ راہ ہوئے۔ لیکن وہ ان تمام کو سر کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ تا آنکہ ہندوستان (پنجاب) میں پہنچ گئے۔ اور یہاں آکر انھوں نے اس کفر آباد میں توحید کی آواز بلند کی۔ اور لوگوں کو بتایا کہ بتوں سے منہ موڑ کر کس طرح ایک اللہ کے سامنے جھکنا چاہیئے۔

کس قدر مقامِ تاسف و تعجب ہے کہ آج ان کے مزار پر وہی کچھ ہو رہا ہے جسے بند کرنے کے لئے وہ یہاں آئے تھے۔ لیکن اس میں نہ کوئی تاسف کی بات ہے نہ تعجب کی۔ یہ شجرِ تصوف کا لازمی پھل ہے۔

عہدِ فاروقؓ از جمالش تازہ شد
حق ز حرفِ او بلند آوازہ شد

ان کی آمد سے یہاں حضرت عمرؓ کے عہد کی یاد تازہ ہوگئی (جن کے زمانے میں اسلام اس تیزی سے پھیلا تھا) اور ان کی تقریر و تحریر کے ذریعے حق کی آواز بلند ہوگئی۔

پاسبانِ عزتِ ام الکتاب
از نگاہش خانۂ باطل خراب

وہ قرآن کے پاسبان تھے۔ ان کی نگاہ سے باطل کا گھر ویران ہوگیا۔

خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت
صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت

ان کے دم سے پنجاب کی خاک زندہ ہوگئی۔ اس مہرِ عالمتاب کی ضیا پاشیوں سے ہماری صبح روشن ہوگئی۔

عاشق و ہم قاصدِ طیارِ عشق
از جبینش آشکار اسرارِ عشق

وہ خود عاشق تھے اور ساتھ ہی عشق کا پیغام دوسروں تک بھی پہنچاتے تھے۔ عشق کے اسرار و رموز ان کی پیشانی سے عیاں ہوجاتے تھے

داستانے از کمالش سر کنم
گلشنے در غنچۂ مضمر کنم

میں ان کے کمال کی ایک حکایت بیان کرتا ہوں۔ حکایت تو مختصر سی ہے۔ لیکن اس میں اسرار و حقائق بہت زیادہ پنہاں ہیں۔ بس یوں سمجھو جیسے ایک غنچہ میں سارا گلستاں سمٹا دیا جائے۔

نوجوانے قامتش بالا چو سرو
وارد لاہور شد از شہرِ مرو

ایک بلند قامت نوجوان، مرو (خراسان) سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

رفت پیشِ سیّدِ والا جناب
تا رباید ظلمتش را آفتاب

وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ اس آفتابِ جہانتاب کی ضوفشانی سے اپنی تاریکیوں کو دور کرے۔

گفت محصورِ صفِ اعدا ستم
در میانِ سنگہا مینا ستم،

اس نے کہا کہ میں دشمنوں کی صف میں گھرا ہوا ہوں۔ بس یوں سمجھئے جیسے ایک نرم و نازک آبگینہ پتھروں کی یورش میں محصور ہو۔

با من آموز اے شہِ گردوں مکاں
زندگی کردن میانِ دشمناں

مجھے یہ بتائیے کہ جب انسان دشمنوں کے اندر گھر جائے تو اسے ایسے حالات میں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

پیرِ دانائے کہ در ذاتش جمال | بستہ پیمانِ محبت با جلال
گفت اے نامحرمِ رازِ حیات | غافل از انجام و آغازِ حیات

وہ مرد بزرگ (حضرت علی ہجویری) کہ جن کی ذات میں جمال و جلال دونوں کی خصوصیات جمع تھیں، اس نوجوان کی طرف مخاطب ہوئے۔ اور اس سے کہا کہ تو زندگی کے راز سے واقف نہیں۔ تو نہیں جانتا کہ آغاز حیات کیا ہے اور اس کا انجام کیا۔ زندگی کسے کہتے ہیں۔ یہ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کی آخری منزل کونسی ہے؟

فارغ از اندیشۂ اغیار شو
قوتِ خوابیدۂ بیدار شو

تجھے چاہیئے کہ دشمنوں کے خطرے کے احساس کو اپنے دل سے الگ کر دے۔ ان کا ڈر تیرے سینہ میں نہ رہے تو ان سے بالکل خائف نہ ہو۔ اگر تو نے اپنے اندر یہ تبدیلی پیدا کرلی تو پھر تیری خفتہ قوتیں بیدار ہو جائیں گی اور جب تو خود قوی ہو جائیگا تو تجھے کوئی دشمن نظر ہی نہیں آئے گا۔ دشمن درحقیقت اپنی ہی کمزوری کا دوسرا نام ہے۔ جب انسان خود کمزور نہ رہے تو اس کا کوئی دشمن باقی نہیں رہتا۔ اس لئے ایسے حالات میں کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ انسان کی اپنی قوتیں بیدار ہو جائیں جب تک انسان اپنے آپ کو کمزور و ناتواں سمجھتا رہتا ہے اسے ساری دنیا دشمن دکھائی دیتی ہے۔

سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد
شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

جب پتھر اپنے آپ کو شیشہ تصور کرنے لگ جائے تو اس میں واقعی شیشہ کی سی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد
نقدِ جانِ خویش با رہزن سپرد

اگر مسافر یہ سمجھ لے کہ میں بڑا کمزور اور ناتواں ہوں تو ہر رہزن اسے لوٹ کرلے جا سکتا ہے۔ صرف لوٹ کر ہی نہیں۔ بلکہ اسے اس کے ہاتھوں جان تک کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ لہٰذہ

تا کجا خود را شماری ماء و طیں
از گِل خود شعلۂ طور آفریں

تو اپنے آپ کو کب تک محض مٹی اور پانی کا پتلا سمجھتا رہے گا۔ تجھے چاہیئے کہ اپنی مٹی میں ایسی حرارت پیدا کرلے کہ اس سے طور سینا کا شعلہ بھڑک اٹھے۔

باعزیزاں سرگراں بودن چرا
شکوہ سنج دشمناں بودن چرا

اپنے عزیزوں سے ناراض ہونا اور غصہ میں آجانا یہ کیوں؟ دشمنوں کی شکایت زبان پہ لے آنا۔ یہ کیوں؟

راست می گویم عدو ہم یار تست
ہستیٔ او در درونِ بازار تست

اگر تم سچ پوچھو تو جسے تم دشمن سمجھتے ہو، وہ تمہارا دوست ہے۔ اس لئے کہ اس کی موجودگی سے تمہاری قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اور اس سے استحکامِ خودی نصیب ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا میں کسی کے ساتھ تصادم نہ ہو۔ کہیں ٹکراؤ نہ ہو تو انسان کی صلاحیتیں خام اور خودی ناپختہ رہ جاتی ہے۔ اگر نہر کے راستے میں پتھروں کی ٹھوکر (FALL) نہ آئے تو اس کی روانیوں میں تیزی پیدا نہ ہو۔ اس لئے

ہر کہ دانائے مقاماتِ خودی است
فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است

جو شخص خودی کے مقامات و منازل سے واقف ہے۔ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ دشمن جس قدر زیادہ طاقت ور ہو۔ وہ اسے خدا کا فضل سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے اسے اپنی قوتوں کے پرکھنے (ٹسٹ کرنے) کا موقعہ ملتا ہے (اسی کو ابتلا یا آزمائش کہتے ہیں) اور وہ یقینی طور پر دیکھ سکتا ہے کہ اس کی خودی کس حد تک پختہ ہو گئی ہے۔ اور ہنوز کس قدر خام ہے۔

کشتِ انساں را عدو باشد سحاب
ممکناتش را برانگیزد ز خواب

جسے تم دشمن سمجھتے ہو۔ وہ تو انسان کی زندگی کی کھیتی کے لئے بادل اور بارش کی مثل ہے۔ جس طرح بارش سے، بیج کے اندر چھپا ہوا پودہ مسکرا کر باہر آجاتا ہے۔ اسی طرح دشمن سے ٹکراؤ انسان کی خفتہ صلاحیتوں کو خواب سے بیدار کر دیتا ہے۔

سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی است
سیل را پست و بلند جادہ چیست

اگر انسان کی ہمت بلند ہو تو ہر سنگِ راہ پانی کی طرح بہہ کر راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ طوفان کے سامنے نشیب و فراز سب یکساں ہوتے ہیں۔ وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ سب پر غالب آتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

سنگِ رہ گردد فنانِ تیغِ عزم
قطعِ منزل، امتحانِ تیغِ عزم

راستے کی مشکلات انسان کے عزم و ارادے کے لئے وہی کام کرتی ہیں جو تلوار کے لئے سان کام کرتی ہے۔ یعنی اس کی دھار کو تیز کر دیتی ہے۔ اس کے جوہر میں جلا پیدا کر دیتی ہے۔ اور ارادے کی تیغ کا امتحان اس سے ہوتا ہے کہ وہ راستے کو کس حد تک قطع کرتی ہے جس قدر راستہ قطع ہوتا جائے گا۔ اسی نسبت سے سمجھا جائے گا کہ فی الواقعہ یہ تلوار تیز ہے۔ بیٹھے رہنے والوں کو اس کا علم و یقین کیسے ہو سکتا ہے کہ ان میں چلنے کی ہمت کس قدر ہے۔ اس لئے عزیزِ من!

مثلِ حیواں خوردن، آسودن چہ سود
گر بخود محکم نہ بودن چہ سود

کھانا۔ سونا اور مر جانا۔ یہ تو محض حیوانوں کی زندگی ہے۔ انسانوں کی نہیں۔ اگر تو اپنے آپ میں محکم نہیں۔ اگر تیری خودی مستحکم نہیں تو اس زندگی سے کیا حاصل ہے؟ زندگی انسان کی زندگی ہے۔ حیوان جیسا ہو جیسا نہ ہوا۔ ایک ہی بات ہے۔

خویش را چوں از خودی محکم کنی
تو اگر خواہی جہاں برہم کنی

اگر تو اپنی خودی کو محکم کر لے تو پھر اگر تیرا جی چاہے تو ساری دنیا کو درہم برہم کر دے۔ خودی کے محکم ہونے سے انسان میں اس قدر قوت آجاتی ہے کہ وہ ساری دنیا کو تہ و بالا کر سکتا ہے

گر فنا خواہی ز خود آزاد شو
گر بقا خواہی بخود آباد شو

اگر تو اپنے آپ کو مٹانا اور فنا کرنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ بڑا آسان ہے۔ اپنی خودی کو آزاد چھوڑ دے۔ اسے مستحکم مت کر اس کی طرف سے بے پروا ہو جا۔ یہ حیوانوں کی زندگی ہوئی۔ اس سے طبعی طور پر تو تم سانس لیتے رہو گے۔ لیکن انسانیت کی زندگی ختم ہو جائیگی لیکن۔ اگر تم باقی رہنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنی خودی کو مستحکم کر لو۔

چیست مُردن! از خودی غافل شدن
تو چہ پنداری فراقِ جان و تن

موت جسم اور جان کے علیحدہ ہو جانے کا نام نہیں۔ موت یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو فراموش کر دے۔ اپنے آپ سے غافل ہو جائے۔ اپنی خودی سے بیگانہ ہو جائے۔ خود فراموشی کا نام موت ہے۔

در خودی گم صورتِ یوسف مقام
از اسیری تا شہنشاہی خرام

تو حضرت یوسفؑ کی طرح اپنی خودی کو مستحکم کر لے۔ اپنی سیرت کو اس قدر پختہ کر لے کہ بڑی سے بڑی لغزش بھی تجھے اپنے مقام سے ہلا نہ سکے۔ اگر تو نے ایسا کر لیا تو سمجھ لو کہ قید خانہ سے تخت شاہی تک پہنچ جاؤ گے۔

از خودی اندیش و مرد کار شو
مرد حق شو، حامل اسرار شو

ہر وقت اپنی خودی کا خیال رکھو۔ اس سے تم دنیا میں کام کے قابل ہو جاؤ گے۔ اس سے تم صاحب عمل ہو جاؤ گے۔ تم سے کارہائے نمایاں سرزد ہوں گے۔ اسی سے تم حق پرست ہو سکو گے اور اسرار حیات سے واقف۔

اس حکایت کے بیان کرنے کے بعد علامہ اقبال کہتے ہیں کہ

شرح راز از داستانہا می کنم
غنچہ از زور نفس وا می کنم

میں زندگی کے بڑے بڑے راز حکایات کے پردے میں کھولتا رہتا ہوں۔ انھیں کہانیاں سمجھ کر نہ پڑھ جاؤ۔ ان کہانیوں سے بڑے بڑے حقائق سمجھ میں آجائیں گے۔ میں ہر راز مستور کے غنچہ کو اپنے زور نفس سے شگفتہ کرتا چلا جاتا ہوں۔ حکایات کے پیرایہ میں افشائے راز اس لئے کرتا ہوں کہ رومی کے الفاظ میں

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

یہ زیادہ بہتر ہوتا ہے کہ انسان اپنے محبوب کی باتیں اپنے الفاظ میں بیان نہ کرے بلکہ دوسروں کی داستان کے رنگ میں بیان کرے۔

اس شعر پر اس باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ دشمن کا مقابلہ کرنے اور نامساعد حالات میں محفوظ و مامون زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی داخلی قوتوں کو بیدار کرے۔ اس سے اپنے مقصد پیش نظر کی صداقت پر یقین اور اس کے حصول کے لئے تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب نگاہ انسانیت کی بلند اقدار پر ہو تو دل سے موت کا ڈر نکل جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ خارجی قوتوں اور طبعی اسباب و ذرائع کا مہیا کرنا بھی ناگزیر ہے۔ یہ نہیں کہ انسان اپنی داخلی صلاحیتوں کی بیداری کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے اور سمجھے کہ اس سے دشمنوں کا خود بخود خاتمہ ہو جائیگا۔ قرآن نے داخلی قوتوں کی بیداری، سیرت کی پختگی اور کردار کی بلندی پر زور دینے کے ساتھ یہ بھی حکم دیا ہے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ .... (پ ۱۰) تم امکان بھر قوت فراہم کرو۔ اپنی سرحدوں پر گھوڑوں کے رسالے تیار رکھو تاکہ اس سے تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو خائف رکھ سکو۔ لہٰذا کوئی ایسا فلسفۂ زندگی اور ضابطۂ اخلاق جو صرف داخلی قوتوں کو کافی سمجھے اور خارجی اسباب و ذرائع کی اہمیت کو کم کرے مسلک گوسفندی ہے۔ قرآنی طریق زندگی نہیں۔ اقبال کے الفاظ میں

من آں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

انڈس

خوبصورت اور پائیدار شیشہ کے برتنوں کا ضامن ہے

ہمارے ہاں

ہر قسم کے شیشہ کے ظروف۔ جگ، گلاس، برنیاں وغیرہ رنگین وسادہ۔ منقش وپھولدار چمنیاں وگلوب۔ بوتلیں واسٹیشنری اشیاء وبلاگ گلاس تیار ہوتے ہیں۔

انڈس گلاس ورکس لمیٹیڈ۔ پوسٹ بکس ۵

گولیمار روڈ — حیدرآباد مغربی پاکستان

مطبوعات طلوع اسلام کی شرائط ایجنسی

شرح کمیشن

سلسلہ معارف القرآن:-

(۱) معراج انسانیت
(۲) ابلیس وآدم
(۳) جوئے نور
(۴) انسان نے کیا سوچا!

۲۵ فیصدی

دیگر مطبوعات
۳۳ فیصدی

قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائے گی

غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی۔

پہلی فرمائش پچاس روپے (بعد وضع کمیشن) سے کم نہیں ہونی چاہیئے۔

ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے ورنہ تعمیل نہ ہو سکیگی۔

(نوٹ) کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے معاملہ طے کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳- ایل ڈی۔اے۔ سی ایچ سوسائٹی، کراچی نمبر ۲۹

آپ نے کبھی سوچا؟

شگفتگی، طراوت اور تبسم کے پیچھے کیا کارفرما ہے؟
گرم دودھ یا لہو، اگر وہ ذرا بھی سرد ہو جائے تو آپ زرد پڑ جاتی ہیں۔
اسکی وجہ؟ آپ کی استعمالی اغذیہ میں اہم حیاتین کی شدید کمی اس خطرے کے تدارک کیلئے آپ کو مرغن غذاؤں کی نہیں بلکہ .....

وِم وائٹ (۳۵ ضروری حیاتین کا مرکب)

کی ضرورت ہے جسے آپ کی صحت، توانائی اور تازگی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اپنی شگفتگی کو برقرار رکھنے کے لئے آج ہی وِم وائٹ خریدیئے۔
ایک گرانقدر طبی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔

آپ رشک کرتے ہیں!

کسی مضبوط اور متناسب جسم کو دیکھ کر۔ کیونکہ آپ لاغر ہیں یا پھر دیسی صحت کے اسباب ڈھونڈ نہیں پاتے۔ آیئے ہم آپ کی مشکل حل کریں۔ کیا آپ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ آپ کی غذا نظام جسمانی کی قطعی ضروریات کو پورا کر رہی ہے؟ کیا آپ کو حیاتین ٹھیک طور پر مہیا ہو رہی ہیں؟ یقیناً کوئی تشفی بخش جواب آپکے پاس نہیں۔

وِم وائٹ (۳۵ ضروری حیاتین کا مرکب)

ایک گرانقدر طبی تحفہ، ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ آپ کی مشکل کا حل ہے۔ جسکے استعمال سے آپ تیزی سے ایک توانا اور قابل رشک صحت تعمیر کر سکیں گے۔
آپ کی صحت کا ضامن۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔

اپنے بچے کو آپ صحتمند، توانا اور بشاش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ صحت افزا اور مقوی اشیا کی تلاش کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر بچے اپنے ماں باپ سے وراثتاً ناقص خون پاتے ہیں۔ یا پھر بالخصوص ماں کے دودھ سے محروم رہتے ہیں۔ اور بازاری دودھ کے سہارے پروان چڑھتے ہیں۔ ان صورتوں کے علاوہ بھی اگر صحت ضروری حیاتین کی کمی کے باعث ناقص رہتی ہے اور کوئی بھی مرض غلبہ پا سکتا ہے۔

بچہ کو ان تمام خدشات سے محفوظ رکھنے کے لئے

وِم وائٹ (۳۵ ضروری حیاتین کا مرکب) خریدیئے

وم وائٹ جو ان تمام چیزوں کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے صحت کی مکمل ضمانت ہے۔
آپکے بچے کے اندرونی نظام کا محافظ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔

ننگِ آدم ننگِ دین ننگِ وطن

۲۸ اگست کے اخبار ڈان (کراچی) میں اس کے مغربی نامہ نگار (اعجاز حسین صاحب) کے قلم سے ایک ایسا مقالہ شائع ہوا ہے جو ہر اس مسلمان کے لئے جو اپنے سینے میں حساس دل رکھتا ہے۔ عبرت و موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ذیل میں اس مقالہ کا آزاد ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

"اقوام متحدہ نے دسمبر ۱۹۴۸ء میں حقوقِ انسانیت سے متعلق جو منشور شائع کیا تھا۔ اس کی ایک شق یہ تھی کہ

> دنیا کے تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں۔ اور احترام و حقوق کے لحاظ سے ایک دوسرے کے برابر..... اس لئے کسی انسان کو غلام بنا کر نہیں رکھا جائے گا۔ اور غلامی اور غلاموں کی تجارت کی ہر شکل کو ممنوع قرار دیا جائے گا۔

ان تمام اقوام نے جو اس ادارہ کی رکن ہیں۔ اس شق کے حق میں رائے دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کے بعض ممالک میں ابھی تک غلامی اپنی بدترین شکل میں موجود ہے۔ بالخصوص بعض مسلم ممالک میں۔

اب جینوا میں ایک اہم کانفرنس اس مقصد کے لئے ہو رہی ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں۔ جن سے غلامی کا پوری طرح سے استیصال ہو سکے۔ غلاموں کی تجارت ختم کر دی جائے اور تمام ایسے اداروں کو بند کر دیا جائے۔ جن میں غلامی سے ملتی جلتی شکلیں رائج ہیں۔ ان تمام تدابیر کو اس منشور میں بطور ضمیمہ شامل کرنے کا خیال ہے جسے لیگ آف نیشنز نے ۱۹۲۶ء میں اختیار کیا تھا۔ یہ کانفرنس اقوام متحدہ کی طرف سے مدعو کی گئی ہے۔ اور اس میں قریب پینتالیس ممالک شریک ہو رہے ہیں۔

غلامی سے متعلق کانفرنسوں کی بحث و تمحیص میں جن حقائق کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ انہیں دیکھ کر ایک حساس (مسلمان) کی نگاہیں شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ان میں مستند ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کی بنا پر بتایا جاتا ہے کہ آج اس خطۂ زمین میں مسلمانوں کے ممالک بالخصوص سعودی عرب۔ یمن اور خلیج فارس کے اردگرد کی اسلامی ریاستوں میں غلامی کس وسیع پیمانے پر موجود ہے۔ ان اطلاعات کی رُو سے، اس بیسویں صدی میں تنہا سعودی عرب میں قریب پانچ لاکھ غلام موجود ہیں۔ اس ملک میں غلامی اپنی قدیم ترین شکل میں رائج ہے۔ وہاں غلاموں کی منڈیاں عام طور پر ملتی ہیں۔ جہاں انسان فروخت ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ دنیا کے مقدس ترین شہر مکہ میں بھی سال کے بعض مہینوں میں غلاموں کی منڈیاں دکھائی دیتی ہیں۔

جدہ میں غلاموں کی تجارت اس سے بھی وسیع پیمانے پر ہوتی ہے۔

عرب کی منڈیوں میں ایک لونڈی کی قیمت اڑھائی ہزار سے پانچ ہزار روپے تک بھی چڑھ جاتی ہے۔ ان کے مقابلہ میں نوجوان غلاموں کی قیمت کچھ کم ہوتی ہے۔ اور ایک بوڑھا غلام پندرہ سو سے پچیس سو روپے تک میں مل جاتا ہے۔ بوڑھی عورت تین سو روپے تک میں بھی مل جاتی ہے۔ سعودی عرب اور یمن کی منڈیوں میں غلام باہر سے آتے ہیں۔ بالخصوص افریقہ کے ان خطوں سے جو فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں ایک غلام لڑکے (عیاض!) کی سرگذشت بیان کرتے ہیں۔ وہ جنوبی افریقہ کا رہنے والا تھا۔ اسے بچپن ہی میں وہاں کے ایک مقامی سردار نے خرید لیا۔ اور وہ اس کے گھر میں قریب دس سال کی عمر تک کام کاج کرتا رہا۔ ۱۹۵۹ء میں یہ سردار اپنے اہل خاندان کے ساتھ حجاز میں حج کے لئے گیا اور اس چھوکرے کو بھی ساتھ لے گیا۔ وہ قریب ایک سال تک ان مقامات مقدسہ میں رہا۔ وہاں اس کی مالی حالت خراب ہوگئی تو اس نے اس لڑکے کو ایک عربی سردار کے ہاتھوں بیچ ڈالا۔ وہ قریب دو سال تک اس کے ہاں رہا۔ اس کے بعد اس سردار نے اسے فروخت کرنے کی غرض سے جدہ کی منڈی میں بھیجدیا۔ وہاں سے وہ کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلا۔ اور ایک غیر ملکی سفارت خانے میں پناہ کے لئے پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ ایک ایسی کشتی میں سوار ہوگیا۔ جس میں اس کے ملک کے حاجی واپس جا رہے تھے اس طرح وہ پھر اپنے وطن میں پہنچ گیا۔

لیکن ایک عیاض کا کیا ذکر؟ اس مقدس ملک میں ہزارہا عیاض شاہزادوں اور سرداروں کے ہاں غلام کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ان سے بالعموم برا سلوک نہیں ہوتا لیکن نہ ان کی کوئی تنخواہ ہوتی ہے۔ نہ محنت کا کوئی معاوضہ۔ نہ کسی قسم کی آزادی (نہ مستقبل کے متعلق کوئی یقین) اس لئے کہ انہیں جب جی چاہے دوسری جگہ فروخت کیا جا سکتا ہے

انتہائی بدبختی ہے کہ غلاموں کی تجارت کو حج کے مہینوں میں زیادہ فروغ ہوتا ہے۔ حج سے کچھ ماہ قبل غلاموں کے سوداگر افریقہ کی بستیوں میں پھیل جاتے ہیں۔ تاکہ وہاں سے انسانوں کو شکار کر کے لائیں۔ یہ شکاری وہاں کے سادہ لوح مسلمان بچوں اور نوجوانوں کو یہ کہکر ساتھ لے آتے ہیں کہ چلو تمہیں فی سبیل اللہ حج کرا لائیں۔ اس مقدس بہانے سے انہیں پھانس لیا جاتا ہے۔ اور عرب اور خلیج فارس کی منڈیوں میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ہر سال ہزاروں "حاجی" (جن بیچاروں نے ابھی حرمین کی زیارت بھی نہیں کی ہوتی) چپکے سے گم ہو جاتے ہیں۔

غلام صرف افریقہ ہی سے نہیں لائے جاتے۔ دیگر ممالک مثل عراق۔ ایران حتیٰ کہ پاکستان سے بھی حاصل کئے جاتے ہیں مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بلوچستان کے قبائلی علاقوں سے خاصی تعداد میں غلام مکران کے ساحل سے عمان کی بندرگاہ میں پہنچائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اب پاکستان کا بحری بیڑہ مکران کے ساحل پر کافی نگہداشت رکھتا ہے۔ بایں ہمہ کہا جاتا ہے کہ وہاں غلاموں کی تجارت کے گماشتے اب بھی مصروف تگ و تاز نظر آتے ہیں۔

لونڈیوں کی تجارت کے علاوہ بعض مسلم ممالک میں عورتوں کی فروخت کے اور طریقے بھی رائج ہیں۔ مثلاً شادی کی غرض

سے عورتوں کو خرید لینا۔ یا قرضے کے بدلے میں مقروض کی عورت کو رہن رکھ لینا۔ یا بڑے بڑے زمینداروں کے ہاں انھیں بیگار میں پکڑ لینا۔ اقوام متحدہ نے بڑی کوشش کی ہے کہ عورتوں کی اس قسم کی غلامی کو بھی مٹایا جائے۔ لیکن انھیں ابھی تک اس باب میں نمایاں کامیابی نہیں ہوئی۔ مثلاً اقوام متحدہ نے مختلف ممالک کی حکومتوں کو ایک سوالنامہ بھیجا ہے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ یہ بتایا جائے کہ اس ملک میں غلامی کس شکل میں اور کس حد تک رائج ہے۔ سعودی عرب کی حکومت نے اس کا کوئی جواب نہیں بھیجا۔ اور بار بار کہنے کے باوجود نہیں بھیجا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ یا ایسی کانفرنسیں جیسی اب جنیوا میں منعقد ہوئی ہے، ہزار ریزولیوشن پاس کریں اور لاکھ منشور شائع کریں۔ ان کے ذریعے ان ممالک سے غلامی نہیں مٹائی جا سکے گی۔ اس کے لئے موثر طریقہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں اس ننگ انسانیت رسم کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کیا جائے۔ اور ان ملکوں کے حکمرانوں کو جن میں غلامی رائج ہی نہیں بلکہ قانوناً جائز ہے بتایا جائے کہ ان کے ملکوں میں غلاموں کی موجودگی سے اسلام کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ رہا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس سوال کو" اسلامی کانگریس کے آئندہ اجلاس میں بھی اٹھایا جائے۔ مسلمانوں کے ترقی پذیر ممالک کو چاہیئے کہ وہ دوسروں کو بتائیں کہ غلامی نہ صرف احترام انسانیت کے بنیادی تصور کے خلاف ہے بلکہ دین اسلام کے بھی خلاف۔ سید امیر علی نے اپنی کتاب" سپرٹ آف اسلام" میں لکھا ہے کہ نبی اکرمؐ اپنے متبعین کو بار بار تاکید فرمایا کرتے تھے کہ وہ غلاموں کو آزاد کردیں۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر نیک عمل اور کوئی نہیں۔ ایلڈن رٹر (ELDON RUTTER) اپنی کتاب "عرب کے مقدس شہر" (HOLY CITIES OF ARABIA) میں لکھتا ہے کہ

اگر قرآن پر صحیح معنوں میں عمل کیا جائے تو اسلامی ممالک میں غلامی یکسر ختم ہو جائے

طلوع اسلام محترم مقالہ نگار کی یہ خوش فہمی ہے کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی ممالک سے غلامی پند و نصائح سے ختم ہو جائے گی۔ انھیں غالباً اس کا علم نہیں کہ ان ممالک میں غلامی محض رواجاً موجود نہیں بلکہ ملاّ کی شریعت اسے مذہباً جائز قرار دیتی ہے۔ اور اس کے خلاف کسی اقدام کو "مداخلت فی الدین" مقالہ نگار نے ترقی پذیر اسلامی ممالک کا ذکر کیا ہے۔ یونہی کی مثال سن لیجئے۔ ہمارا خیال ہے کہ پاکستان کو اسلامی ممالک میں ترقی پذیر ملک شمار کیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں جماعت اسلامی کو ترقی پذیر مذہب کی نمائندہ۔ اسی پاکستان میں جب طلوع اسلام نے کہا کہ اسلام میں غلامی قطعاً ناجائز ہے تو سب سے پہلے جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اس کی مخالفت کی اور بڑے فخر اور دھڑلے سے لکھا کہ دشمن کے قیدیوں کو شریعت حقہ کی رو سے غلام اور لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں آپ کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ اسلامی ممالک سے غلامی کو اس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک ہمارے علمائے کرام اور ان کی خود ساختہ شریعت موجود ہے۔ اس کے خاتمہ کی وہی ایک شکل ہے جس کی طرف اس مغربی

مصنف نے اشارہ کیا ہے یعنی قرآن کو دین کی بنیاد قرار دینا۔ اس سے نہ غلام باقی رہ سکتے ہیں۔ نہ غلام بنانے والے ملّا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ملّا مسلمانوں کو قرآن کے قریب نہیں آنے دیتا۔ لیکن زمانے کے تقاضے خود ان انسانیت کُش جراثیم کو ختم کر دیں گے۔ اور انسان قرآن کی عطا کردہ آزادی کی فضا میں سانس لینے کے قابل ہو جائے گا۔ وہ زمانہ بہت جلد آرہا ہے

بعد کی خبر

جس جینوا کانفرنس کا ذکر سابقہ مقالہ میں کیا گیا ہے۔ اس کا اجلاس شروع ستمبر میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کے ابتدائی اجلاس کی جو کارروائی اسی مقالہ نگار اعجاز حسین صاحب کی طرف سے (ڈان مورخہ ۹ ستمبر میں) شائع ہوئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ کانفرنس کی طرف سے ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی کہ سمندر کے راستے غلاموں کی تجارت کو خلاف قانون قرار دیا جائے اور متعلقہ اقوام کو اس کے اختیارات دیئے جائیں کہ جن جہازوں کے متعلق شبہ ہو کہ وہ غلام لئے جا رہے ہیں۔ ان کی تلاشی لی جائے اور ملزم ثابت ہونے کی صورت میں انہیں اپنے قبضہ میں کر لیا جائے۔ اس تجویز کی مصر، سعودی عرب، سوڈان اور پاکستان کی طرف سے سخت مخالفت کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ اس سے خدشہ ہے کہ طاقتور قومیں ان اختیارات کو کمزور قوموں کے خلاف سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کریں گی۔ چنانچہ یہ تجویز مسترد کر دی گئی اس میں شک نہیں کہ یہ خدشہ صحیح ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن ان ممالک کو چاہیئے تھا کہ اس کی جگہ کوئی ایسی متبادل تجویز پیش کرتے جس سے یہ خدشہ بھی نہ رہتا۔ اور غلامی جیسی لعنت کے خلاف موثر اقدامات بھی ہو سکتے۔

نکاح نابالغان

اسی کانفرنس میں پرتگال کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ نکاح کے لئے کم از کم عمر چودہ سال مقرر کی جائے۔ اور فریقین کی رضامندی کو نکاح کے لئے لازمی شرط قرار دیا جائے۔ پاکستان کے نمائندے نے اس کی بھی مخالفت کی۔

اسے ایسا کرنا ہی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ پاکستان اب لادینی ریاست نہیں خدا کے فضل سے اس کا آئین "اسلامی" ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اس اسلام کا آئین نہیں جسے خدا نے دیا تھا بلکہ یہ اس اسلام کا آئین ہے جس کے علمبردار ہمارے علماء حضرات ہیں۔ اس آئین کی رو سے ایک بے دین ملک (پرتگال) کی اس تجویز کی کس طرح تائید کی جا سکتی تھی کہ نکاح بالغ لڑکوں اور لڑکیوں ہی کا ہونا چاہیئے۔ اور وہ بھی ان کی باہمی رضامندی سے! ملّا کی شریعت سال بھر کے بچے کا نکاح بھی جائز قرار دیتی ہے۔ اور اس کے خلاف کچھ کہنے کو مداخلت فی الدین! آپ دیکھتے نہیں کہ آجکل پاکستان میں اس تجویز کے خلاف کہ نکاح صرف بالغوں کا ہونا چاہیئے یہ حامیانِ شرع متین کس طرح شمشیر و سناں بکف ہو کر میدان جہاد میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔

اب تو ہمارے اس فاضل نامہ نگار کو خود ہی معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں کے ان ممالک (جن کے اعصاب پر ابھی تک ملّا سوار ہے) یہ توقع رکھنا کہ وہ اس قسم کی اصلاحات پر آمادہ ہو جائیں گے خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (۴/۶۵)

تیرے رب کی قسم۔ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے متنازعہ فیہ معاملات میں تجھے حکم نہ بنائیں۔

اطاعتِ رسول

پرویز

اطاعتِ رسول

پرویز

دین کا مقصود و مطلوب یہ ہے کہ انسان کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے نکال کر قوانین خداوندی کی اطاعت میں لایا جائے اس کے لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللّٰهِ ۔ وَلٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ .... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ سے کتاب اور حکومت اور نبوت لے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب ربانی بن جاؤ۔

اطاعت صرف اللہ کی ہے

اسی حقیقت کو اس نے دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۔ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۔ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۔ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۱۲/۴۰)

(یاد رکھو) حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ یہی دین محکم ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

اس مقام پر اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کی رو سے خدا کی محکومیت اور خدا کی عبادت سے مراد ایک ہی ہے یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت۔ مندرجہ بالا آیت میں دیکھئے پہلے کہا کہ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ حکومت صرف اللہ کے لئے ہے اور اس کے بعد کہا کہ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو اب ظاہر ہے کہ اگر عبادت سے مراد پرستش لی جائے۔ تو آیت کے کچھ معنی ہی نہیں بنتے۔ یعنی۔ حکومت صرف اللہ کے لئے ہے تم صرف اسی کی پرستش کرو۔ خدا کی پرستش تو ہر حکومت میں ہو سکتی ہے۔ اقوام متحدہ نے "بنیادی حقوقِ انسانیت" کا جو منشور شائع کیا ہے۔ اس میں پرستش کی آزادی کو انسانوں کا بنیادی حق قرار دیا ہے۔ اور اسے تمام اقوامِ عالم نے تسلیم کیا ہے۔ اس لئے پرستش کے لئے خدا کی حکومت کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ خدا کی پرستش تو ہم انگریز کے عہدِ حکومت میں بھی کرتے تھے۔ اور آج ہندوستان کا مسلمان بھی خدا کی پرستش کرتا ہے۔ اس لئے قرآن کی رُو سے خدا کی عبادت سے مراد

ہی اس کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے سورۂ کہف کی دو آیات میں یوں واضح کیا ہے۔ ایک جگہ ہے

لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۔ (۱۱۰/۱۸)

اسے چاہیئے کہ خدا کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے

اور دوسری جگہ ہے۔

لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۲۶/۱۸)

خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا

دیکھئے۔ ایک جگہ عبادت کا لفظ آیا ہے۔ اور اسی مفہوم کے لئے دوسری جگہ حکومت کا لفظ۔

اس مقام پر اس نقطہ کی وضاحت اس لئے بھی ضروری سمجھی گئی ہے کہ ذرا آگے چل کر اس سے "مذہب" اور "دین" کا فرق سمجھ میں آسکے گا

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ اطاعت اور محکومیت صرف خدا کی ہو سکتی ہے کسی انسان کی نہیں۔

(۲) لیکن خدا تو ہمارے سامنے (محسوس شکل میں) نہیں ہوتا۔ ہم اس کے احکام کو براہ راست سن نہیں سکتے اس لئے اس کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ اس کے لئے اس نے خود

یہ اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ ہی بتا دیا کہ یہ اطاعت اس کتاب کی رو سے کی جائے جسے اس نے نازل کیا ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔ (۱۱۵/۶)

کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم بنا لوں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف اپنی وہ کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ اور کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ وہ غیر اللہ کی اطاعت ہو جائے گی۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۔ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۳/۷)

تم اس کتاب کی اتباع کرو جو تمہارے خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ اور اس کے سوا کسی کارساز کی اتباع نہ کرو (لیکن) بہت کم لوگ ہیں جو اس اہم حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

یہی کفر اور ایمان کا نقطۂ امتیاز ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

(۳) اگر خدا کی اطاعت سے مقصود محض خدا کی پرستش (WORSHIP) پوجا پاٹ۔ بندگی ہوتا تو ہر شخص اپنی اپنی جگہ خدا کی کتاب کی اطاعت کر سکتا تھا۔ کوئی مندر میں کوئی مسجد میں کوئی صومعہ میں کوئی کلیسا میں کوئی خانقاہ میں۔ کوئی زاویہ میں۔ "مذہب" کی رو سے خدا کی اطاعت کا یہی مفہوم ہے۔ اس کی رو سے "مذہب"

دین اور مذہب میں فرق

خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے عملی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ لہٰذا "مذہب" میں ہر انسان اپنے اپنے طور پر خدا کی اطاعت کرتا ہے۔

لیکن "دین" کی رو سے حقیقت یہ نہیں۔ اس کی رو سے خدا کی اطاعت سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اور انسان کے مابین جس قدر تنازعہ فیہ امور ہوں۔ ان کا فیصلہ قوانین خداوندی کی رو سے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کوئی ایسا مقام نہ ہو۔ جہاں سے دو فریق اپنے تنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ کرائیں۔ اس لئے کسی حَکم کی ضرورت ہوگی بالفاظ دیگر مذہب میں ہر شخص خدا کی اطاعت انفرادی طور پر کرتا ہے۔ لیکن دین میں خدا کی اطاعت اجتماعی طور پر کرائی جاتی ہے لہٰذا مذہب میں اطاعت کے لئے صرف خدا کی کتاب کافی ہوتی ہے۔ لیکن دین میں خدا کی اطاعت کے لئے کتاب کے علاوہ کسی جیتی جاگتی شخصیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام دین (نظام) ہے مذہب نہیں۔ اس لئے اس میں تنہا کتاب کافی نہیں اس کتاب کے مطابق اطاعتِ خداوندی کرانے والا مرکز بھی ضروری ہے۔ یہ مرکزی شخصیت خدا کا رسول ہوتا ہے۔ جو لوگ رسول کی اطاعت ضروری نہیں سمجھتے۔ اور اطاعت کے لئے مجرد قرآن کو کافی سمجھتے

کتاب کی اطاعت بذریعہ رسول

ہیں وہ دینِ اسلام کو اس "مذہب" کی سطح پر لے جاتے ہیں۔ جو دیگر اقوام عالم میں رائج ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ خدا نے کتاب کے ساتھ ہمیشہ رسول کو بھیجا۔ جس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ کیونکہ رسول خدا کی اطاعت ہی کراتا ہے۔ لہٰذا۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴/۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی

لیکن یہ اطاعت رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہوتی۔ کیونکہ (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ کسی نبی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ اس لئے خود رسول اللہ سے کہدیا گیا کہ اس نے لوگوں کے تنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرنے ہیں۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

تم ان کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔

اب بات یہ ہوئی کہ خدا کی اطاعت براہ راست نہیں کی جا سکتی۔ اس کی اطاعت رسول کی وساطت سے کی جا سکتی ہے لیکن رسول چونکہ بشر ہوتا ہے۔ اور کسی بشر کی اطاعت جائز نہیں۔ اس لئے رسول کی اطاعت اس کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگرچہ بنظر بظاہر اطاعت اسی (رسول) کے فیصلوں ہی کی ہو رہی ہوتی ہے۔ انسان اور خدا کے قانون کی اطاعت کا یہ فرق اتنا لطیف اور باریک تھا کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جب لوگ اشخاص (بادشاہوں) کی اطاعت ہی کے خوگر تھے اور نظام (قانون) کی اطاعت کو (APPRECIATE) نہیں کر سکتے تھے۔ اس فرق کو سامنے لانا قرآن ہی کا اعجاز تھا۔ وہ ایک جگہ اللہ کی اطاعت کا ذکر کرتا ہے تو اس خیال سے کہ اس سے لوگ اپنے اپنے طور پر "خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی" نہ سمجھ لیں۔ ساتھ ہی رسول کی اطاعت کا بھی ذکر کر دیتا ہے۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ اس سے کہیں ایک شخص کی اطاعت نہ سمجھ لی جائے (جیسا کہ بادشاہوں کی اطاعت ہوتی تھی) پھر توجہ کو اللہ کی طرف منعطف کرا دیتا ہے اور یوں اللہ سے رسول اور رسول سے اللہ کی طرف لے جاتا ہوا اس اہم حقیقت کو اچھی طرح سے ذہن نشین کراتا چلا جاتا ہے۔ سورۂ نسا کی مندرجہ ذیل آیات میں دیکھئے کہ اس لطیف نکتہ کو کس حسن و خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے اس اصول کو بیان کیا کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ہم نے ہر رسول کو اس لئے بھیجا تھا کہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

اس اصولی حقیقت کے بیان کرنے کے بعد اس کے عملی پہلو کو سامنے لایا گیا۔ اور کہا وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ ان لوگوں سے جب قانون شکنی ہو گئی تھی۔ ان سے جب کوئی جرم صادر ہو گیا تھا۔ انہوں نے حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی تھی۔ تو اس کے ازالے کی شکل یہ نہیں تھی کہ یہ اپنی اپنی جگہ توبہ استغفار کر لیتے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ جَآءُوْكَ یہ تیرے پاس آتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین (نظام خداوندی) میں کسی ایسی شخصیت کا ہونا ضروری ہے جس کی طرف لوگ رجوع کریں۔

لیکن اس سے ذہن اس طرف جا سکتا تھا کہ اس باب میں صاحب اختیار (خدا نہیں بلکہ) وہ شخصیت ہے جس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس لئے اس کے ساتھ ہی کہدیا کہ جَآءُوْكَ۔ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ تمکے تو تیرے پاس لیکن اپنے جرم کی پاداش سے حفاظت (PROTECTION) (جسے عرف عام میں معافی یا بخشش کہتے ہیں) اللہ سے مانگتے اس سے پھر ذہن اس طرف جا سکتا تھا کہ اگر اللہ ہی سے حفاظت طلب کرنی تھی تو ہم اپنے اپنے ہاں براہِ راست خدا سے معافی مانگ لیتے۔ اس کے لئے رسول کے پاس آنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس لئے اس کی وضاحت کر دی کہ فَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ۔ یہ حفاظت طلبی اور عفو خواہی خدا اور بندے کے درمیان انفرادی طور پر (براہِ راست) نہیں ہو سکتی اس کے لئے ضروری ہے کہ رسول بھی بیچ میں ہو اور وہ ان کے لئے حفاظت طلب کرے۔

اب ظاہر ہے کہ یہ معافی رسول ہی کی زبان سے عطا ہوئی۔ لیکن اس خیال سے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں خدا کا تو

کوئی واسطہ ہی نہیں رہا اسے پھر دہرا دیا کہ اگر وہ ایسا کرتے کہ اپنی حفاظت طلبی اور عفو خواہی کے لئے رسول کے پاس آتے اور رسول (حالات کے مطالعہ اور ان کی بات سننے کے بعد) مطمئن ہو جاتا کہ ان کا جرم (قانونِ خداوندی کی رُو سے) قابلِ معافی ہے تو وہ انہیں معافی دے دیتا۔ لیکن یہ معافی درحقیقت قانونِ خداوندی کی رو سے معافی ہوتی کیونکہ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا (۴/۶۴)، تو یہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور سامانِ رحمت عطا کرنے والا پاتے۔

رسول کے فیصلے

اس کے بعد اگلی آیت میں بات صاف کر دی کہ دین میں متنازعہ فیہ امور میں خدا کے احکام کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہے۔ فرمایا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ نہیں یہ بات نہیں (جیسا کہ یہ لوگ مذہب کے پرانے تصور کے مطابق اپنے دل میں سمجھے بیٹھے ہیں) بات یہ ہے کہ تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ (خدا کا مطیع ہونا تو ایک طرف) مومن بھی نہیں ہو سکتے۔ جب تک یہ اپنے متنازعہ فیہ امور میں تجھے (اے رسولؐ) اپنا حکم نہ بنائیں (پہلی آیت میں 'جَاءُوكَ' کہا گیا تھا۔ اس سے مراد یہی تھی، یہ تجھے حکم بنائیں۔ تو فیصلہ دے اور یہ تیرے فیصلہ کی اطاعت کریں۔ لیکن کیسی اطاعت ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵)، پھر جو کچھ تو فیصلہ کرے اس کے خلاف اپنے دل میں بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کریں اور اس کی پوری پوری اطاعت کریں۔ اس لئے کہ انسان کسی فیصلہ کے خلاف دل میں گرانی اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ سمجھے کہ یہ شخص مجھے اپنا حکم سنا رہا ہے۔ لیکن جب حقیقت یہ ہو کہ وہ قانون کی اطاعت کرا رہا ہو تو پھر اس اطاعت سے دل میں کبیدگی پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اس قانون کی صداقت پر ایمان نہیں۔ اس لئے شروع میں کہا گیا تھا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ......

(۲) تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ خدا کی اطاعت درحقیقت قوانینِ خداوندی (کتاب اللہ) کی ایسی اطاعت ہے جو اس رسول کی وساطت سے کی جائے جو اس قانون کو نافذ کرتا ہے۔ اسی کو قرآن میں "اللہ اور رسول کی اطاعت" کہا گیا ہے اگر اس سے خدا اور رسول کی الگ الگ اطاعتیں مراد لی جائیں تو یہ چیز خود قرآن کے اس واضح اصول کے خلاف چلی جائے گی کہ کسی بشر کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ اسے

اللہ اور رسول کی اطاعت

خدا نبوت و کتاب ہی کیوں نہ عطا کرے کہ وہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے (۳/۷۸)، اور خدا نے رسول کو بار بار بشر (كَبَشَرٍ مِّثْلُكُمْ) کہا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو (کہ یہ دو الگ الگ اطاعتیں نہیں بلکہ ایک ہی کی اطاعت ہے) نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ "اللہ اور رسول" کا ذکر کر کے اس کے بعد ضمائر (PRONOUNS) واحد لائی گئی ہیں۔ اور فعل کے صیغے بھی واحد (حالانکہ عربی قاعدے کی رُو سے ان مقامات میں ضمائر اور صیغے تثنیہ کے آنے چاہئیں تھے) مثلاً

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ

وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (۸/۲۰)

اے جماعتِ مومنین۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اس سے روگردانی مت کرو۔ درانحالیکہ تم سن رہے ہو۔

دیکھئے۔ یہاں اللہ اور رسول (دو) کا ذکر ہے اور عنہ میں ضمیر واحد ہے (نیز وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ اطاعت اس کی کی جاتی ہے جس کی بات سنی جاسکے۔ جو محسوس طور پر درمیان میں موجود ہو۔ جو محسوس طور پر موجود نہ ہو۔ عملی معاملات میں اس کی اطاعت کی ہی نہیں جاسکتی)

اسی طرح اسی سورۂ انفال میں دوسری جگہ ہے

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ... ... (۸/۲۴)

اے جماعت مومنین! تم اللہ اور رسول کی دعوت کا جواب دو۔ جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں (موت سے نکال کر) زندگی عطا کردے۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کا ذکر ہے اور صیغہ (دَعَاكُمْ) واحد کا ہے۔ اسی طرح سورۂ نور میں ہے۔

وَاِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (۲۴/۴۸-۴۹)

اور جب ان لوگوں کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ ان کے تنازعہ فیہ امور میں فیصلہ کرے۔ تو ان میں کا ایک فریق اس سے گریز کرتا ہے۔ اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو (جس سے وہ سمجھ لیں کہ فیصلہ ان کے حق میں جائیگا تو) وہ اس کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

یہاں بھی اللہ اور رسول کی طرف بلائے جانے کا ذکر ہے۔ لیکن بعد میں لِيَحْكُمَ میں صیغہ واحد ہے اور اِلَيْهِ میں ضمیر واحد کی۔ اسی طرح کی اور مثالیں بھی ہیں۔ اس انداز بیان کا سمجھ لینا ہمارے ذہن میں کچھ مشکل نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں بھی گورنمنٹ (حکومت) یا نظام یا اجتماعی ادارہ (ORGANISATION) کے لئے واحد ہی کے صیغے استعمال ہوتے ہیں یہی مفہوم قرآن کے ان مقامات میں ہے۔

دین کا نظام (۵) یہ حقیقت کہ اللہ اور رسول سے مراد وہ نظام یا نظام مرکز (نظام۔ امیر) ہے جو اللہ کے قانون کو عملاً نافذ کرتا ہے۔ قرآن کے دیگر مقامات سے بھی واضح ہے۔ مثلاً سورہ انفال میں ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ. قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ (۸/۱)

تجھ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہدو کہ مالِ غنیمت "اللہ اور رسول" کا ہے۔

اس آیت میں ذرا آگے چل کر ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ ..... (۸/۴۱)

اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں مالِ غنیمت سے ملے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے ہے۔

ان تمام مقامات میں (نیز ۴/۸۳ میں جہاں "اللہ اور رسول" کے خلاف۔ جنگ۔ بغاوت کرنے کے جرم کی سزائیں لکھی ہیں) "اللہ اور رسول" سے مراد امام یا امیر یا اسلامی نظام ہے۔ یہ مفہوم الو کھا نہیں بلکہ شروع ہی سے ایسا سمجھا جاتا رہا ہے۔ اور اب بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس پر ہمارے دور کی تفسیریں شاہد ہیں (مثلاً ابوالکلام صاحب آزاد کا ترجمان القرآن۔ اور مودودی صاحب کی تفہیم القرآن)

اولی الامر کی اطاعت

(۶) ان تصریحات کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ جس میں اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ. فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ..... (۴/۵۹)

اے ایمان والو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے صاحب اختیار لوگوں کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تمہیں اختلاف (منازعت) ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ۔

اس آیت میں اسلامی نظام کا پورا نقشہ دیدیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ "اللہ اور رسول" کی اطاعت اس نظام خداوندی کی اطاعت ہے جسے سب سے پہلے رسول اللہ نے متشکل فرمایا۔ اس نظام میں تمام متنازعہ فیہ امور کے فیصلوں کے لئے رسول کے پاس آنے کا حکم تھا۔ لیکن جب یہ نظام مدینہ سے آگے بڑھا تو یہ عملاً ناممکن تھا کہ دور دراز کے لوگ اپنے مقدمات کے فیصلوں کے لئے مرکز کی طرف آتے۔ اس کے لئے مختلف مقامات میں ماتحت افسر (صاحبانِ امر) مقرر کرنے پڑے۔ ان افسروں (یا عدالتوں) کی اطاعت خود مرکزی حکومت کی اطاعت تھی۔ لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ اور وہ یہ کہ مرکزی حکومت کے فیصلوں

کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا فیصلہ حرفِ آخر تھا۔ لیکن ان ماتحت عدالتوں کے فیصلے کے خلاف مرکز میں اپیل ہو سکتی تھی۔ یہ مطلب ہے اس کا کہ فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والی الرسول۔ اگر تم میں اور اولی الامر (صاحبانِ امر۔ افسرانِ اعلیٰ) میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تم ایسے معاملہ کو مرکز کی طرف (REFER) کرو۔ وہاں سے جو فیصلہ صادر ہو اس کی اطاعت تم پر فرض ہو جائے گی۔

(۷) رسول اللہؐ کے ذمے اس ضمن میں دو کام تھے۔ ایک تو تنازعہ فیہ امور میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرنا۔ اور دوسرے کتاب اللہ نے جن قوانین کو محض اصولی طور پر بیان کیا تھا اور ان کی جزئیات کو دانستہ چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ بھی اصولوں کی طرح ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہ قرار پا جائیں (جیسا کہ ۵/۱۰۱ سے ظاہر ہے) اپنے حالات کے مطابق ان کی جزئیات متعین کرنا۔ سوال یہ ہے کہ حضورؐ ان امور کو کس طرح سرانجام دیا کرتے تھے۔ کیا یہ کچھ وحی کے ذریعہ ہوتا تھا یا حضورؐ اپنے طور پر کرتے تھے؟ جہاں تک مقدمات میں فیصلہ کرنے کا تعلق ہے

حضورؐ فیصلے وحی کی رُو سے نہیں کرتے تھے

بخاری کی ایک حدیث اس سوال کا جواب واضح طور پر پیش کرتی ہے۔ اس کی جلد دوم کتاب الشہادت میں ہے کہ

> حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ میرے سامنے اپنے جھگڑے پیش کرتے ہو۔ سو ایسا ہو سکتا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرنے میں زیادہ تیز واقع ہوں (الحن بحجتہ من بعض) (اور میں اس سے متاثر ہو جاؤں) کہ وہ سچا ہے اور اس کے حق میں فیصلہ دیدوں! سو اگر میں کسی شخص کو اس کے بیان کے مطابق اس کے بھائی کا حق دیدوں تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں نے اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں۔ اسے چاہیئے کہ اسے نہ لے۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ مقدمات کے فیصلے اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق کیا کرتے تھے۔ جس کا مدار ان بیانات اور شہادات پر ہوتا تھا جو آپ کے سامنے بہ حیثیت جج کے پیش کی جاتی تھیں۔ لہٰذا ان میں اس کا بھی امکان تھا کہ حقدار کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے۔ اگر یہ فیصلے وحی کی رُو سے ہوتے تو ان میں اس قسم کا امکان ہو نہیں سکتا تھا۔ ہم اس حدیث کو اس لئے صحیح تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے۔ جس میں حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْ اِلَیَّ رَبِّیْ (۳۴/۵۰)

ان سے کہدو کہ اگر میں کسی معاملہ میں غلطی کرتا ہوں تو وہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے (اس کا ذمہ دار میں خود ہوتا ہوں۔ لہٰذا اس کا وبال بھی مجھ ہی پر ہوگا) اور اگر میں صحیح راستہ

پر ہوتا ہوں تو وہ اس وحی کی بنا پر ہے جو میرے رب کی طرف سے میری طرف آئی ہے

یہ آیت اور وہ روایت ایک ہی حقیقت کو پیش کرتی ہیں۔

جزئیات کا تعین اب رہا جزئیات کا متعین کرنا تو اس کے لئے قرآن نے حضورؐ کو حکم دے دیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) تم معاملات میں ان (جماعتِ مومنین) سے مشورہ کیا کرو۔ اس حکم کے ماتحت یہ تمام امور باہمی مشاورت سے طے پاتے تھے چنانچہ کتبِ احادیث و سیر میں کئی واقعات مندرج ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ مثلاً قرآن میں ہے اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ ... (۶۲/۹) (جب تمہیں جمعہ کے صلوٰۃ کے لئے پکارا جائے) اس میں صلوٰۃ کے لئے ندا (پکارنے) کا تو ذکر ہے۔ لیکن قرآن نے اس ندا کے طریق (اذان) کو متعین نہیں کیا۔ اب یہ دیکھئے کہ اذان کس طرح سے متعین ہوئی تھی۔ مشکوٰۃ کتاب الاذان میں ہے کہ

> عبداللہ بن زید بن عبد ربہ نے کہا کہ جب رسول اللہ نے ناقوس بجانے کا حکم دیا تاکہ اسے بجا کر لوگوں کو نماز کے لئے جمع کریں تو مجھ کو خواب میں ایک شخص دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ناقوس تھا۔ پس میں نے خواب ہی میں اس سے پوچھا۔ اے اللہ کے بندے کیا فروخت کرتا ہے تو ناقوس کو؟ اس نے کہا تو ناقوس کا کیا کرے گا۔ میں نے کہا ہم اس سے لوگوں کو نماز کے لئے بلائیں گے۔ اس نے کہا کیا میں تجھ کو ایسی چیز نہ بتلا دوں جو اس سے بہتر ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا اللہ اکبر اللہ اکبر الخ۔ اور اسی طرح تکبیر پس جب صبح ہوئی میں رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا خواب بیان کیا۔ پس فرمایا آپ نے۔ تحقیق یہ خواب حق ہے۔ جو خدا چاہے۔ پس کھڑا ہو تو بلالؓ کے ساتھ اور جو خواب میں دیکھا ہے۔ اس کو بتلا اور وہ اذان کہے۔ اس لئے کہ وہ بلند آواز ہے۔ پس کھڑا ہوا میں بلالؓ کے ساتھ اور اس کو اذان کے کلمے بتلانے لگا۔ اور وہ اذان کہتے رہے۔ راوی کا بیان ہے کہ جب عمر بن الخطابؓ نے اپنے گھر میں اذان کی آواز سنی تو چادر گھسیٹتے ہوئے گھر سے نکلے۔ اور رسول اللہ سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے۔ میں نے بھی ایسا ہی خواب میں دیکھا ہے جیسا کہ دکھایا گیا عبداللہ کو۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ پس خدا ہی کے لئے تعریف ہے۔ (ابوداؤد۔ دارمی۔ ابن ماجہ)

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان جزئیات کو رسول اللہؐ وحی کے ذریعے متعین نہیں فرمایا کرتے تھے۔

لہ چونکہ میں ان احادیث کا ترجمہ خود نہیں کر رہا۔ اس لئے جس طرح شائع شدہ ترجمہ موجود ہے اسی طرح پیش کیا جا رہا ہے۔

حضورؐ کے بعد

(۸) رسول اللہؐ کی زندگی میں یہ نظام (دین) اس نہج سے قائم رہا۔ جب حضورؐ نے وفات پائی تو کیفیت یہ ہوگئی کہ خدا کی کتاب تو موجود تھی۔ لیکن وہ محسوس شخصیت جس نے کتاب اللہ کی اطاعت کرانی تھی موجود نہ رہی۔ یہ تو الگ بات ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر امت کو نہیں دیا تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسا مجموعہ موجود بھی ہوتا تو بھی شکل وہی رہتی کہ کتابیں موجود تھیں لیکن مرکزی شخصیت موجود نہ تھی۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ کتابوں کی از خود اطاعت کرنا "مذہب" میں تو ممکن ہے دین میں ممکن نہیں۔ دین میں کتاب اللہ کی اطاعت کرائی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے محسوس شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین کو رسول اللہؐ کی زندگی تک ہی باقی رہنا تھا۔ اور حضورؐ کے بعد اسے پھر مذہب بن جانا تھا؟ یعنی کیا رسول اللہؐ کے بعد "خدا اور رسول" کی اطاعت لوگوں نے از خود (انفرادی طور پر) کرنی تھی۔ یا یہ اطاعت کسی مرکزی شخصیت کے ذریعے کرائی جانی تھی؟ قرآن نے اس کے متعلق پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ سلسلہ رسول اللہؐ کی زندگی تک ہی نہیں۔ حضورؐ کے بعد بھی بدستور جاری رہے گا۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ..... (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز اس کے نہیں کہ اللہ کا رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول گذرے ہیں۔ سو اگر یہ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم اس کے بعد پھر الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔

خلیفۃ الرسول کی اطاعت

ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد دین کے باقی رہنے کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ رسول کا ایک جانشین ہوتا جو محسوس شخصیت کی حیثیت سے رسول کی جگہ لے لیتا۔ اسے خلیفۃ الرسول (رسول کا جانشین) کہا جاتا ہے چونکہ قرآن نے جماعتِ مومنین سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے معاملات باہمی مشوروں سے طے پائیں گے۔ اس لئے صحابہؓ نے باہمی مشورے سے خلیفۃ الرسول کا انتخاب کر لیا۔ اور یوں دین کا سلسلہ علیٰ حالہٖ قائم رکھا۔ اب یہ مومنین کا منتخب کردہ خلیفہ مومنین کے مشورے سے کتاب اللہ کے مطابق تمام امور کے فیصلے کرتا تھا۔ لہٰذا اس کی اطاعت وہی حیثیت رکھتی تھی۔ جو رسول اللہؐ کی اطاعت کی حیثیت تھی۔ اب "اللہ اور رسول کی اطاعت" کی عملی شکل خلیفۃ الرسول کی اطاعت تھی۔ اسی لئے رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ

(مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریقے اور میرے خلفائے راشدین مہدیین کے طریقے کی پیروی لازمی ہے

حضورؐ کا یہ ارشاد دین کی روح کے عین مطابق اور قرآن کی اس آیت کی عملی تعبیر تھا۔ جس میں کہا گیا ہے کہ

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ
غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ
مَصِيرًا ۔ (۴/۱۱۵)

اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے۔ بعد اس کے کہ اس پر خدا کی ہدایت ظاہر ہو چکی ہو اور مومنین کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرے۔ تو ہم اس کا تعلق اس سے جوڑ دیں گے۔ جس سے وہ اپنا تعلق قائم کرتا ہے۔ اور اسے جہنم میں داخل کر دینگے اور وہ بری جگہ ہے۔

امت کے باہمی مشورے سے نصب امامت اور اس امام (امیر المومنین) کی اطاعت سبیل المومنین تھی جس کی اتباع کا حکم قرآن نے دیا تھا۔ اس کو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہتے ہیں۔

(۹) ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ رسول اللہ کا فریضہ یہ تھا کہ (۱) لوگوں کے متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرتے تھے اور (۲) قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات متعین فرماتے تھے۔ جہاں تک پہلی شق کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ خلیفۃ الرسول اس فریضہ کو بدستور انجام دیتا تھا۔ اب فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (تیرے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے۔ جب تک اپنے متنازعہ فیہ امور میں تجھے حکم نہ بنائیں) میں لفظ (تجھے) سے مراد خلیفۃ الرسول تھا۔ اب تمام متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ خلیفہ کی طرف سے ہوتا تھا۔ باقی رہی دوسری شق (یعنی جزئیات کا تعین BY LAWS کا بنانا) سو اس کے متعلق کتب روایات و آثار میں ایسی شہادات موجود ہیں۔ جن سے واضح ہے کہ خلیفۃ الرسول ان فرائض کو بھی سرانجام دیتا تھا۔ اس کی شکل یہ تھی کہ

جزئیات میں تبدیلی

(۱) جن امور کی جزئیات پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں۔ ان کی جزئیات متعین کی جاتی تھیں مثلاً شراب کی سزا نبی اکرمؐ کے زمانے میں مقرر نہیں ہوئی تھی (ایسا کوئی واقعہ ہی سامنے نہیں آیا ہوگا) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی سزا چالیس کوڑے مقرر فرمائی (حضرت عمرؓ نے اسے اسّی کوڑے کر دیا تھا)

(۲) جو جزئیات پہلے متعین ہو چکی تھیں۔ اور ان میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی انھیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جاتا۔ جیسے ایک آئینی حکومت کا بھی انداز ہوتا ہے۔ اس میں سابقہ حکومت کے فیصلے بدستور نافذ العمل رہتے ہیں۔ تا آنکہ تغیر حالات سے ان میں تبدیلی نہ کر دی جائے۔

(۳) جن جزئیات میں [illegible] حالات کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ان میں تبدیلی کر دی جاتی تھی۔ اس لئے کہ یہ جزئیات ابتداءً بھی وحی کی رو سے متعین نہیں ہوئی تھیں کہ ان میں وحی ہی کوئی تبدیلی کر سکتی۔ اس کی متعدد مثالیں کتب روایات و آثار میں موجود ہیں مثلاً۔

(۱) نبی اکرمؐ کے زمانے سے لے کر عہد صدیقیؓ تک ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک شمار کر کے طلاق رجعی قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں ان تین شمار کر کے طلاق مغلظ قرار دے دیا۔ چنانچہ فقہ کی رو سے امت کا عمل اسی کے مطابق ہو رہا ہے (ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ قرآن کی رو سے صحیح طلاق کی پوزیشن کیا ہے ہم یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہماری کتب روایات و سیر میں ایسے واقعات ملتے ہیں۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانے کے فیصلے حضورؐ کے خلفاء کے عہد میں بدلے جا سکتے تھے۔ اور چونکہ ایسا کیا جانا قرآن کے منشا اور نظام دین (نظام اسلامی) کے اقتضاء کے عین مطابق ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی تبدیلیاں ضرور ہوئی ہونگی

(۲) نبی اکرمؐ نے جنگ کے قیدیوں کا فدیہ ایک دینار فی کس مقرر فرمایا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے مختلف ممالک میں مختلف شرحیں مقرر فرمائیں۔

(۳) نبی اکرمؐ نے زمین کی پیداوار کی مختلف اجناس کی شرح خراج بالتفصیل مقرر نہیں فرمائی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں ہر جنس کے متعلق خراج کی شرح (کہ فلاں چیز پر اتنا خراج ہوگا۔ اور فلاں پر اتنا) متعین فرمائی۔

(۴) حضورؐ کے زمانے میں مولفۃ القلوب کو صدقات کی مد سے امداد دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے ختم کر دیا۔

(۵) نبی اکرمؐ کے زمانے میں بعض مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس سسٹم کو ختم کر دیا۔

(۶) رسول اللہ نے لوگوں کے وظائف سادی مقرر فرمائے تھے۔ یہی طریق حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں بھی رائج رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے انھیں خدمات کے تناسب سے بدل دیا۔

(۷) نبی اکرمؐ کے زمانہ میں تجارتی گھوڑوں اور سمندر سے برآمد شدہ چیزوں پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان پر زکوٰۃ قائم کی۔

(۸) حضرت عمرؓ نے فیصلہ دیا کہ جنگ کے دوران میں کسی پر حد جاری نہ کی جائے۔ اور قحط کے زمانے میں چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

یہ چند واقعات محض بطور مثال درج کر دیئے گئے ہیں۔ انہی میں حضرت عمرؓ کی اولیات کو بھی شامل کر لیا جائے جن کی تعداد مورخین نے چالیس پچاس سے کم نہیں بتائی، تو ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن سوال تعداد کا نہیں، اصل سوال تو یہ ہے کہ عہد خلفائے راشدین میں اس اصول کو تسلیم کیا جاتا تھا کہ اگر زمانے کے تقاضے اس کے خواہاں ہوں تو نبی اکرمؐ کے زمانے کے فیصلوں میں مناسب ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک خلیفہ کے فیصلے کو خلیفہ مابعد بھی بدل سکتا ہے۔ مثلاً حضرت عثمانؓ کے زمانے تک اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کا رواج تھا۔ (اس کی اجازت قرآن میں موجود ہے)

لیکن حضرت علیؓ نے بعض خدشات کے پیش نظر اسے بند کر دیا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جن امور کی قرآن نے اجازت دی ہوئی ہے۔ اگر حالات کا تقاضا ایسا ہو تو مرکز ملت انھیں وقتی طور پر بند بھی کر سکتا ہے۔

ان واقعات سے اس حقیقت کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کہ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں یہ جزئیات وحی کی رو سے متعین نہیں ہوتی تھیں۔ کیونکہ اگر یہ وحی سے متعین ہوتیں تو حضورؐ کے خلفائے راشدین میں سے کسی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچ سکتا تھا کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی (یا حک و اضافہ) کر سکتا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی صاحب وحی نہیں تھا۔ وحی کا سلسلہ حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ اس باب میں حضورؐ کو صحابہؓ سے مشورہ لینے کا حکم تھا۔ اور خلفائے راشدین بھی اپنے اپنے زمانہ میں باہمی مشاورت سے ان میں تبدیلیاں کر دیتے تھے۔ وحی کی رو سے متعین شدہ جزئیہ میں کوئی بھی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ مثلاً قرآن نے کہا ہے کہ وضو میں ہاتھ کہنیوں تک دھونے چاہئیں۔ اب کسی کو اس کا اختیار نہیں کہ یہ کہدے کہ نہیں! ہاتھ پہنچوں تک ہی دھونے چاہئیں۔ بہرحال یہ تھی صورت جزئیات میں تبدیلی کی۔ خلفائے راشدین کے زمانے تک۔ جن کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت تھی

خلافت راشدہؓ کے بعد

(۱۰) دین کا یہ سلسلہ خلفائے راشدین تک قائم رہا۔ اس کے بعد منقطع ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ سلسلہ بدستور قائم رہتا تو (مثلاً چوتھے خلیفہ کے بعد) پانچویں خلیفہ کی اطاعت بھی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی حیثیت رکھتی۔ اور وہ بھی وہی فرائض انجام دیتا جو رسول اللہؐ اور بعد کے خلفاؓ سرانجام دیتے تھے۔ اس کے بعد چھٹا۔ ساتواں۔ آٹھواں ..... ہر خلیفہ کی یہی پوزیشن ہوتی۔ اور اگر یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے ہم تک پہنچ جاتا تو ہمارے وقت کے خلیفہ راشد کی وہی حیثیت ہوتی جو پہلے خلفائے راشدین کی تھی۔ اس کے طریق کی پیروی بھی رسول اللہؐ کے طریقہ (سنت) کی پیروی کی طرح لازم ہوتی۔ اس وقت یہ سوالات ہی پیدا نہ ہوتے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کا مفہوم کیا ہے۔ رسول کی اطاعت کیسے کی جاتی ہے۔ دین میں کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ کی ٹھیک ٹھیک حیثیت کیا ہے۔

یہ سوالات اس وقت پیدا ہوئے جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ یعنی کتاب تو موجود رہی۔ لیکن وہ محسوس شخصیت باقی نہیں رہی۔ جس نے کتاب اللہ کی اطاعت کرانی تھی۔ اب اطاعت انفرادی ہو گئی۔ اب یہ سوال سامنے آیا کہ "اللہ اور رسول کی اطاعت" میں اللہ کی اطاعت تو کتاب اللہ کی رو سے کی جا سکتی ہے۔ رسول کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کے لئے کہا گیا کہ یہ اطاعت رسول اللہ کی احادیث کی رو سے کی جائے گی۔ اس کے سوا اس کی کوئی دوسری شکل ہی ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ لہٰذا اب رسول اللہ کی احادیث کے جمع اور مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چونکہ یہ چیز ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ ہر معاملہ کے متعلق جانتا کہ اس کے متعلق خدا کی کتاب اور رسول اللہ کی احادیث میں کیا لکھا ہے اس لئے عوام کو لامحالہ صاحب علم لوگوں کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس طرح امت میں پیشوائیت وجود میں آئی۔ اور اس کے

ساتھ ہی مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔

یہ کچھ انفرادی طور پر ہو رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی حکومت بھی قائم تھی۔ وہ اپنے دائرے میں اپنے قوانین و احکام کی اطاعت کراتی تھی۔ چونکہ دو متوازی حکومتیں بیک وقت چل نہیں سکتی تھیں اس لئے ان اختیارات کی تقسیم یوں ہوئی کہ ذاتی معاملات (PERSONAL LAW) کے متعلق علماء و فقہا اتھارٹی قرار پائے اور امور سلطنت کے متعلق اتھارٹی سلاطین کی تسلیم کی گئی۔ اس طرح اسلام میں ثنویت (DUALISM) آگئی جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ثنویت آج تک جاری ہے۔ جہاں مسلمان غیر مسلموں کی حکومت میں رہتے ہیں۔ وہاں دنیاوی امور میں حکومت کے قوانین کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اور پرسنل لا میں شریعت کی۔ جس کے فیصلے علماء اور مفتی حضرات کرتے ہیں جہاں ان کی اپنی حکومتیں ہیں۔ وہاں بھی علماء حضرات کتاب و سنت کی تعبیر کا حق اپنے پاس رکھتے ہیں حکومت کو نہیں دیتے آپ نے غور کیا کہ ایک محسوس شخصیت (مرکز ملت) کے باقی نہ رہنے سے امت کی زندگی کے ہر گوشے میں کس طرح انتشار ہی انتشار (CHAOS) پیدا ہو گیا۔ یہ انتشار اس وقت تک چلا آرہا ہے۔

اب کیا کیا جائے؟

(۱۱) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ جس محسوس شخصیت (مرکز ملت) کے گم ہو جانے سے یہ سارا انتشار پیدا ہوا ہے۔ اسے پھر سے قائم کر دیا جائے۔ جہاں سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ وہیں سے اسے پھر سے جوڑ دیا جائے۔ اس وقت اسلام دین کی شکل کو چھوڑ کر مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے اسے پھر سے دین میں تبدیل کر دیا جائے۔ پھر وہ مرکز سامنے آجائے جسے ہم تمام متنازعہ فیہ امور میں اپنا حکم بنائیں اور اس طرح خدا کے اس حکم کی اطاعت کر سکیں کہ فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم (۴/۶۵) ہم میں جو یہ خیال پیدا کر دیا گیا ہے کہ اب خلافت راشدہ کا سلسلہ قائم ہی نہیں کیا جا سکتا تو یہ ناامیدی FRUSTRATION کا نتیجہ ہے۔ اسلام نے قیامت تک زندہ رہنا ہے۔ اس لئے اس میں خلافت کا سلسلہ بدستور سابق قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ خلافت علیٰ منہاج نبوت ہو گی۔

(۱) جو امت کے تمام متنازعہ امور کا فیصلہ کرے گی۔

(۲) جو کچھ اس وقت ہمارے پاس شریعت کے نام سے موجود ہے کتاب اللہ کی روشنی میں اس کا جائزہ لے گی جو کچھ اس میں غلط ہو گا اسے محو کر دے گی۔ جس جس بات میں موجودہ حالات کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت ہو گی اس میں مناسب تبدیلی کر دے گی۔ باقی علیٰ حالہٖ رہنے دے گی۔

جب تک خلافت کا یہ سلسلہ قائم نہیں ہو جاتا، کسی فرد کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ امت کے امور شریعت (نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ کی جزئیات) جس طریق پر چلی آرہی ہیں اس میں کوئی تغیر و تبدل کرے وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ یہ بتا دے کہ فلاں معاملہ میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ قرآن کے مطابق نہیں۔

(۱۲) میری کوشش یہ ہے کہ ہم میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا سلسلہ قائم ہو جائے۔ تاکہ ہم پھر اللہ اور

رسول" کی اطاعت کر سکیں۔ جس طرح جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں "اللہ اور رسول" کی اطاعت کی جاتی تھی۔ اس کے لئے میرا طریق کار یہ ہے کہ (بغیر کسی قسم کی فرقہ سازی کے) قوم کے صاحب فکر طبقہ کے سامنے یہ حقیقت لائی جائے کہ دین کا صحیح مفہوم کیا ہے اور خدا اور رسول" کی اطاعت کی عملی شکل کیا؟

والسلام

طلوع اسلام

★ — طلوع اسلام بلند پایہ علمی پرچہ ہے۔

★ — پاکستان کے ہر گوشے اور ہر طبقہ میں گہری دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

★ — پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی جاتا ہے۔

★ — اس میں شائع شدہ اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گذرتے ہیں

★ — اِس میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

نرخنامہ اشتہارات ناظم ادارہ شعبۂ اشتہارات سے حاصل کیجئے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳ - ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی۔ کراچی

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ برش
ٹوتھ پیسٹ
MAKES TEETH PEARLY WHITE

اسکیم پیشگی خریدارانِ ادارہ طلوعِ اسلام

مئی ۱۹۵۳ء میں نافذ کی گئی تھی۔ اسکیم میں قارئین طلوع اسلام سے اپیل کی گئی تھی کہ چونکہ طلوع اسلام کی آواز بہت محدود ہے اور زمانے کا تقاضہ ہے کہ اسے دور تک پھیلایا جائے۔ اس لئے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے اس تعاون کی شکل یہ ہے کہ آپ

پیشگی خریداران کے حلقے میں

شامل ہو جائیں۔ یعنی آپ ایکسو روپیہ یکمشت یا دس ماہانہ اقساط میں) ادا فرما دیں۔ اس کے معاوضہ میں رسالہ طلوع اسلام اور اس ادارہ کی مطبوعات اس وقت تک آپ کو ملتی رہیں گی۔ جب تک آپ کی یہ رقم پوری نہ ہو جائے۔ قارئین طلوع اسلام میں سے کچھ حضرات نے ہماری آواز پر لبیک کہا اور ان کی معاونت سے قرآنی نظام ربوبیت سے متعلق بہت سا لٹریچر اب تک شائع اور ملک کے اطراف و جوانب میں پھیلایا جا چکا ہے لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا ہے۔ ابھی ادارہ کی طرف سے بہت سی اہم کتابیں اور شائع ہوں گی۔ یہ کہتے ہوئے

ہمیں بڑی مسرت ہوتی ہے

کہ ہماری یہ اسکیم اس حیثیت سے کامیاب رہی کہ بیشتر پیشگی خریداران کی وصول شدہ رقم ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء کے حسابات کے گوشوارے تمام خریداران کی خدمت میں بھیجے جا چکے ہیں اور ۱۹۵۶ء کا خرچ شامل کرنے کے بعد بعض خریداران کے کھاتہ میں رقم ختم ہو گئی ہے اور بعض کے کھاتے میں رقم موصولہ سے زیادہ خرچ ہو چکا ہے۔ ان تمام حضرات سے تجدید رقم کی درخواست کی جا چکی ہے کہ انہیں مزید

ایکسو روپے جلد از جلد بھیج دینے چاہئیں

تاکہ قرآنی لٹریچر کی اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رکھا جا سکے۔ اور ادارہ نے جو قدم اٹھایا وہ مسلسل آگے بڑھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہتے ہوئے ہمیں افسوس ہے کہ ہماری یہ اسکیم ابتک اتنی عام نہیں ہو سکی جس قدر ہماری خواہش تھی۔ اس لئے اس سلسلہ میں مزید کوشش کرنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات اس اسکیم میں شریک ہو سکیں۔ یاد رکھیئے! اس اسکیم میں شامل ہونے سے آپ ادارہ طلوع اسلام کو اپنی گرہ سے کچھ نہیں دیتے آپ جس قدر رقم دیتے ہیں اس قیمت کی کتابیں آپ کے گھر بیٹھے مل جاتی ہیں اور ان پر محصول ڈاک بھی ادارہ خود ادا کرتا ہے۔ آپ سے وصول نہیں کرتا۔ ادارہ کی مدد صرف اتنی ہوتی ہے کہ اسے یہ رقم پیشگی مل جاتی ہے۔ کیا آپ ادارہ کی اتنی سی مدد بھی نہیں کریں گے؟

نوٹ: پہلے ماہانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ہے جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاہیں وہ دے سکتے ہیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۳/۱۵۹۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ایچ سوسائٹی) کراچی ۲۹

طلوعِ اسلام کنونشن

سکریٹری بزم طلوع اسلام لاہور نے اطلاع دی ہے کہ مجوزہ کنونشن کے لئے ملک کے مختلف گوشوں سے بزموں نے اپنے نمائندے بھیجنے کی اطلاعات دی ہیں اور ایجنڈے کے لئے متعدد تجاویز بھی بھیجی ہیں۔ ان تجاویز کے موضوع حسب ذیل ہیں۔

(۱) مرکز کی تاسیس (۲) مرکزی فنڈ کا قیام (۳) شعبہ نشر و اشاعت اور پریس کا قیام (۴) قرآنی فکر کو عام کرنے کیلئے دیگر تجاویز۔

(۲) کنونشن کے لئے حسب ذیل پروگرام مشروط طور پر تجویز کیا گیا ہے۔

بروز جمعہ۔ ۱۶ر نومبر

صبح۔ باہمی تعارف۔ جنرل میٹنگ۔ جس میں سکریٹری بزم طلوع اسلام لاہور ایڈریس پیش کرینگے۔ صدر کا انتخاب ہوگا اور ایجنڈا کے مختلف مدات پر غور کرنے کیلئے سب کمیٹیاں متعین کی جائیں گی۔ نماز جمعہ دارالقرآن بنسبت روڈ میں ادا کی جائیگی جسمیں محترم پرویز صاحب خطبہ دیں گے۔ شام کو سبجکٹس کمیٹی اور دوسری سب کمیٹیوں کے اجلاس ہونگے۔

ہفتہ۔ ۱۷ر نومبر

صبح۔ جنرل میٹنگ۔ جس سے محترم پرویز صاحب خطاب کریں گے۔ شام۔ جنرل میٹنگ

اتوار۔ ۱۸ر نومبر

صبح۔ دارالقرآن (بنسبت روڈ) درس قرآن از محترم پرویز صاحب (۲) الوداعی میٹنگ۔ (جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ پروگرام مشروط ہے)

(۳) متعدد بزموں کی تجاویز اور مشوروں کی روشنی میں طے پایا ہے کہ کنونشن دارالقرآن۔ شالامار ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوگی جو پاکستان منٹ کے دروازے کے سامنے جی۔ ٹی روڈ پر واقع ہے (۴) چونکہ جملہ احباب کی خواہش اور آرزو ہے کہ اس مختصر سے قیام کے دوران میں زیادہ سے زیادہ وقت اجتماعی رنگ میں گذارا جائے اس لئے اس اجتماع میں "کیمپ لائف" ہوگی۔ (۵) رہائش اور خوراک کا انتظام بزم طلوع اسلام لاہور کے ذمہ ہوگا۔ البتہ جو احباب رضاکارانہ طور پر اس انتظام میں بزم مذکور کا ہاتھ بٹانا چاہیں۔ ان کی پیشکش بشکریہ قبول کی جائے گی۔ (۶) نومبر میں لاہور میں سردی شروع ہو جاتی ہے اس لئے احباب اس لحاظ سے بستر ہمراہ لائیں (۷) بار دیگر عرض ہے کہ ہر بزم کم از کم دو نمائندے ضرور بھیجے۔ جن مقامات پر بزمیں نہیں وہاں سے اگر کوئی صاحب تشریف لانا چاہیں تو وہ اپنے ارادہ سے مطلع فرمائیں بشرط گنجائش انہیں بھی مدعو کیا جا سکیگا (۸) جن احباب کو کنونشن میں مدعو کیا جائیگا۔ ان کی خدمت میں نام بنام دعوت نامے بھیجے جائیں گے۔ بزموں کے نمائندوں کو بزم متعلقہ کی وساطت سے اور دوسرے حضرات کو براہ راست۔ (۹) تمام مہمان اپنی آمد کی اطلاع دس نومبر تک سکریٹری بزم طلوع اسلام ۱۴۴ بنسبت روڈ۔ لاہور کو ضرور پہنچا دیں (۱۰) مزید اطلاعات طلوع اسلام کی نومبر کی اشاعت میں شائع کی جائیں گی۔ والسلام۔

سکریٹری بزم طلوع اسلام لاہور

اسلام کی سرگزشت

(ایرانی لٹریچر)

گذشتہ اقساط میں ان اثرات کی نشاندہی کے بعد جو دیگر ادیان وملل خصوصاً ایرانی مذاہب زردشتیت مانویت اور مزدکیت نے اسلام پر چھوڑے تھے۔ مضمون کی پچھلی قسط میں ان اثرات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو ایرانی لٹریچر نے عربی لٹریچر پر مرتب کئے تھے۔ یہ بیان ہنوز جاری ہے۔

(چہارم) ایران کی ایک اور چیز بھی تھی۔ جس نے عربی لٹریچر کی زندگی پر بڑا نمایاں اثر کیا ہے۔ اور وہ ایرانی گانا تھا۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ عربوں نے زیادہ تر نغمات ایران ہی سے لئے اور اپنے عربی اشعار کو ان کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ ابوالفرج نے اپنی کتاب "الاغانی" میں لکھا ہے کہ "عربی گانوں کا حضرت عمر بن الخطاب کے عہد میں کوئی رواج نہیں تھا۔ عربوں کے ہاں جو کچھ گانا ہوتا تھا۔ وہ حدی خوانی تک محدود ہوتا تھا۔ یہ کچھ گانا نہیں تھا۔ بلکہ اشعار کو پڑھنے کا ایک خاص انداز تھا۔ البتہ اس میں کسی قدر طرب کی چاشنی، آواز کا اتار چڑھاؤ اور زیروبم ضرور ہوتا تھا[1]"

ابوالفرج ہی کا بیان ہے کہ "سعید بن مسجح ...... خاندان بنی جمح کا آزاد کردہ غلام ..... مکہ کا باشندہ اور سیاہ فام تھا۔ بہت بڑا گویا تھا۔ بلکہ بلند مرتبہ اور سربرآوردہ گویوں میں سے تھا۔ جس نے سب سے پہلے گانے کے اصول وضوابط بنائے اور ایرانی نغمات کو عربی نغمات میں منتقل کیا۔ اس کے بعد وہ شام چلا گیا۔ اور وہاں سے اس نے رومی، بربطی اور اسطوخوسی الحان کو لیا۔ اور ایران آیا۔ اور یہاں آکر اس نے اچھی طرح گانا اور باجوں کو بجانا سیکھا۔ اس کے بعد وہ حجاز واپس آیا اور یہاں بیٹھکر اس نے ان نغمات میں انتخاب کیا۔ اور ان کے محاسن کو لے کر جو نغمے اسے برے معلوم ہوئے۔ یعنی ایرانیوں اور رومیوں کے ہاں وہ نغمے موجود تھے۔ مگر عربی گانے سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ان نغمات کو اس نے خارج کردیا اور پھر اس طرز پر جو اس

---

[1] اغانی صفحہ ۱۴۹ ج ۸

نے منتخب کیا تھا۔ گانا شروع کیا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے گانے کو رواج دیا۔ اور اس میں لحن پیدا کیا۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں نے اسی کی پیروی کی۔

ابوالفرج نے ایک دوسری حکایت بھی بیان کی ہے کہ مسجح کا ایک دن ایرانیوں پر گذر ہوا۔ جب کہ وہ مسجدِ حرام کی تعمیر میں مصروف تھے۔ مسجح نے فارسی زبان میں ان کے گانے کو سنا اور اس نے اسے عربی شعر میں ڈھال دیا۔

أَلَمْ تَعَلَى طَلَلٍ عَفَا مُتَقَادِمُ

ابوالفرج ہی کا بیان ہے کہ ابن مسجح کے آقا نے اسے گاتے ہوئے سنا اور اس سے پوچھا کہ یہ تو نے کہاں سے سیکھا؟ مسجح نے کہا کہ میں نے ان ایرانیوں کو گاتے ہوئے سنا۔ میں نے اس میں تھوڑا سا الٹ پھیر کر کے اس شعر کے وزن پر ڈھال لیا۔ ابن مسجح کے آقا نے کہا کہ میں تجھے اس کے صلہ میں خدا کے لئے آزاد کرتا ہوں مگر وہ اپنے آقا کے ساتھ ہی رہا۔ جس نے اس کی تربیت پر خاص توجہ دی اور وہ گانے کے فن میں برابر ترقی کرتا رہا حتیٰ کہ مکہ میں وہ اس فن کا ماہر مانا جانے لگا۔

اس کے علاوہ ایک تیسری روایت ہے جو صفوان جمحی نے اپنے باپ سے نقل کی ہے کہ سب سے پہلے ایرانی گانوں کو عربی گانوں میں سعید بن مسجح نے منتقل کیا جو بنو مخزوم کا آزاد کردہ غلام تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ معاویہ ابن ابی سفیان نے جب اپنے مکانات بنائے ...... تو عراق سے انھوں نے کچھ ایرانی معمار منگائے جو ان مکانات کو گچ اور پکی اینٹوں سے بناتے تھے سعید بن مسجح ان معماروں کے پاس آیا کرتا تھا۔ وہ مکانات بناتے ہوئے برابر گاتے رہتے تھے۔ اسے جو الحان ان کے پسند آتے وہ انھیں لے کر عربی اشعار پر ان کو ڈھال لیا کرتا۔ پھر اسی انداز پر وہ اس فن کو ترقی دیتا چلا گیا[۱]۔

نیز انھوں نے ایک دوسرے مقام پر بیان کیا ہے کہ "ابن محرز جن کے والد کعبہ کے محافظین میں تھے۔ ایرانی النسل تھے زرد رو اور دراز قامت آدمی تھے۔ کبھی مکہ میں رہتے تھے اور کبھی مدینہ میں۔ جب وہ مدینہ منورہ آتا تو تین ماہ یہاں قیام کرتا اور عزّہ میلاء سے باجا بجانا سیکھتا۔ پھر مکہ معظمہ واپس آجاتا اور تین ماہ یہاں قیام کرتا اور پھر یہاں سے وہ ایران جاتا اور ایرانی نغمات وہاں سیکھتا۔ وہاں سے پھر شام جاتا اور شام میں رومی نغمات کی تعلیم حاصل کرتا۔ اس کے بعد اس نے ایرانی اور رومی نغمات میں سے جو باتیں اسے پسند نہیں آئیں اس نے انھیں چھوڑ دیا اور جو باتیں پسند آئیں وہ لے لیں اور پھر ان کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ آمیز کر کے ان نغمات کو مرتب کیا جو اس نے عربی اشعار کے لئے بنائے تھے۔ اس طرح اس نے وہ نغمے پیش کئے جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے۔ لوگ اسے "صناج العرب" کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے دو دو جوڑا شعار گانے کو رواج دیا جس کی پیروی تمام بعد میں آنے والے گویوں نے کی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ افراد ایک ایک شعر کے ساتھ الحان مکمل طور پر ادا نہیں ہو سکتے۔ ابوالفرج کا بیان ہے کہ ابن محرز نے سب سے پہلے جتنا کچھ گانا سیکھا تھا۔ وہ

---

[۱] آغانی ص۱۰ ج ۳ ومابعد

ابن مسیح ہی سے سیکھا تھا۔[1]

ابن خرداذبہ کا بیان ہے کہ "عبداللہ بن عامر نے چند باندیاں نوحہ گر نیوالی خریدی تھیں۔ اور وہ انھیں مدینہ منورہ سے کر آیا تھا۔ ان کے لئے جمعہ کا دن مقرر تھا جس میں وہ اپنا ناچ گانا دکھاتی تھیں۔ اور لوگ ذوق وشوق سے ان کا گانا سُنا کرتے تھے۔ اس کے بعد ایک ایرانی شخص آیا جسے لوگ شیط کہہ کر پکارتے تھے۔ اس نے اپنا گانا سنایا جو عبداللہ بن جعفر کو بہت پسند آیا۔ سائب خاثر نے عبداللہ بن جعفر سے کہا ـــــ یہ بھی ایرانی غلام تھا اور ایرانی جنگ میں گرفتار ہو کر آیا تھا ـــــ کہ میں تمہیں اس ایرانی گانے جیسا ایک گانا بنا دیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے یہ گت ترتیب دی۔

لِمَنِ الدِّيَارُ سُوْمُهَا قَفْرُ

ابن الکلبی کہتے ہیں کہ یہ پہلا عربی گانا تھا جو اسلام میں گایا گیا تھا۔[2]

اس سے تم نے دیکھ لیا کہ عربی نغمات اور ان کی ترتیب میں ایرانیوں کے کس قدر گہرے اثرات ہیں۔ لیکن یہ چیز ہمارے لئے کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا زیادہ تر تعلق فن سے ہے۔ البتہ جو چیز ہمارے لئے اس سے بڑھ کر اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ عربوں نے مجالس غناء کی صورت اور گانا سننے کے لئے جمع ہونے کے انداز میں بھی ایرانیوں کی پوری پوری نقل کی تھی۔ یہ مجلسیں ـــــ علاوہ ازیں کہ وہ گانے کی مجلسیں ہوتی تھیں ـــــ لٹریری مجلسیں بھی ہوتی تھیں ان کے لئے پاکیزہ اور نازک اشعار منتخب کئے جاتے یا بنائے جاتے تھے۔ تاکہ وہ ذوقِ موسیقی کے مطابق ہو سکیں اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ ان مجلسوں میں ادبی مباحثے۔ عمدہ قصے۔ خوشکن لطائف وظرائف، بلند مرتبہ نادرہ گوئی کے نمونے، شعراء اور ادباء کی مسابقت اور قبولیت عامہ حاصل کرنے کی کوششیں۔ غرضیکہ یہ سب باتیں ہی ہوا کرتی تھیں۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ ان چیزوں نے عربی لٹریچر کو آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں کس قدر مدد بہم پہنچائی ہوگی اور اس کی تہذیب وتجدید میں کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔

اس بات کی دلیل کہ عربوں نے گانے کی یہ مجلسیں ایرانیوں سے لی تھیں اور عربوں نے ایرانیوں کی پوری پوری نقالی کی تھی۔ صاحب تاج کا وہ بیان ہے جو "اخلاق الملوک" کے ماتحت انھوں نے ذکر کیا ہے۔ بات تو بڑی لمبی ہے لیکن ہم اتنا حصہ ہی مختصراً بیان کریں گے جو ہمارے نزدیک اہم ہے۔ "تاج" کے مصنف نے ایک مستقل باب باندھا ہے۔ جس کا عنوان انھوں نے "باب المنادمت" رکھا ہے۔ چنانچہ وہ اس میں کہتے ہیں۔ "ابتداءً ہم ایرانی بادشاہوں کا تذکرہ کرینگے کیونکہ اس بارے میں وہی ہمارے پیشرو ہیں۔ انھیں سے ہم نے ملک اور مملکت کے قوانین سیکھے ہیں۔ اور یہ بھی کہ خواص اور عوام کی کس طرح رتبہ بندی کرنی چاہیئے۔ نیز یہ بھی کہ رعیت کا انتظام کس طرح کرنا چاہیئے۔ اور ہر طبقہ کو کس طرح اس کے کام پر

---

[1] الاغانی صـ ۱۴۵ ج ۱۔ [2] اغانی صـ ۱۶۹ ج ۷

لگائے رکھنا چاہیئے۔ اور یہ کہ کس طرح ہر طبقہ کی قوت و استعداد پر انحصار کرنا چاہیئے۔" اس کے بعد صاحب تاج نے بتایا ہے کہ ایرانی شہنشاہ اپنے ندیموں کے ساتھ کیا کچھ کرتے اور کس طرح انھیں مختلف طبقوں اور درجوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اور ان میں سے ہر طبقہ کی مجلس کہاں ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ایرانی شہنشاہ اردشیر ابن بابک سے لے کر یزدگرد تک اپنے ندیموں سے پردہ میں بیٹھتے تھے۔ ندیموں اور بادشاہوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہوتا تھا۔ بادشاہ اور طبقۂ اول کے ندیموں کے درمیان بیس ہاتھ کا فاصلہ ہوا کرتا تھا کیونکہ یہ پردہ بادشاہ سے دس ذراع کے فاصلہ پر ہوا کرتا تھا۔ اور ندیموں کا پہلا طبقہ اس پردہ سے دس ذراع کے فاصلہ پر بیٹھتا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے ان لوگوں کو برابر احکام ملتے رہتے تھے کہ وہ کیا کریں اور کیا گائیں۔" اس کے بعد صاحب تاج نے کہا ہے "میں نے اسحاق بن ابراہیم سے سوال کیا کہ کیا خلفائے بنو امیہ اپنے ندیموں اور گویوں کے سامنے آتے تھے؟ تو اسحٰق بن ابراہیم نے بتایا کہ امیر معاویہ، مروان، عبدالملک، سلیمان، ہشام اور مروان بن محمد کے درمیان اور ندیموں کے درمیان میں پردہ ہوا کرتا تھا۔ جب خلیفہ کسی گویے کے گانے پر بہت زیادہ لطف اندوز ہوتا حتیٰ کہ اچھلنے کودنے چلنے۔ شانوں کو مٹکانے۔ ناچنے اور ننگا ہونے لگتا تو اسے اس حالت میں بجز اس کی خاص خاص باندیوں کے اور کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ البتہ جب کبھی پردے کے پیچھے سے کوئی آواز یا خوشی کا نعرہ یا ناچنے اور حرکت کرنے کی ایسی آواز آجاتی جو حد سے بڑھی ہوئی ہوتی تو پردہ کا منتظم کہہ دیا کرتا تھا ــــ باندی! بس بس صبر کرو، ضبط سے کام لو۔ تاکہ بیرونِ پردہ ندیم یہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ حرکات کسی باندی سے سرزد ہو رہی ہیں۔ لیکن باقی خلفائے بنو امیہ تو وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ ندیموں اور گویوں کے سامنے ناچنے لگیں اور ننگے ہو کر برہنہ سامنے آجائیں۔ اس کے بعد صاحب تاج نے عباسی خلفاء کی مجلسوں کا حال بیان کیا ہے۔ جو اس مقام پر ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

سطور بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ یہ خلفاء گانے اور لہو و لعب کی مجلسیں ترتیب دیتے تھے۔ اور یہ مجلس انھوں نے ایرانیوں سے لی تھیں۔ کتاب الاغانی کا اگر تم مطالعہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ گورنروں اور اراکین دولت کی مجلسیں بھی اسی رنگ کی ہوا کرتی تھیں۔ اگرچہ وہ خلفا کی مجلسوں کے مقابلہ میں ذرا فروتر ہوتی تھیں بلکہ بولنے والوں، گانے والوں اور سننے والوں کی آزادی کے اعتبار سے ان سے بڑھی ہوئی ہوتی تھیں کہ ان مجلسوں میں ہر شخص اپنی عادات کے مطابق بات کر سکتا تھا۔ یہ چیز ہم خود تم پر چھوڑ دیتے ہیں کہ ادب اور فن پر یہ چیزیں کہاں تک اور کس حد تک اثر انداز ہوتی ہوں گی۔

(نجم) ایسا نظر آتا ہے کہ بنو امیہ کے آخری عہد حکومت میں ایرانیوں نے عربی رسم الخط کو ایک دوسرے طریقہ پر بدل دیا تھا جسے اس سے پہلے عرب لوگ نہیں جانتے تھے۔ یہ وہی لکھنے کا انداز ہے۔ جس میں عبدالحمید کاتب اور اس کا اسکول مشہور چلا آتا ہے۔ یہ عبدالحمید ہی مروان ابن محمد ــــ بنی امیہ کے آخری خلیفہ ــــ کا کاتب تھا۔ صاحب عقد فرید کا بیان ہے کہ وہ عبدالملک بن مروان اور یزید کا کاتب تھا۔ اس کے بعد خلفائے بنی امیہ کا برابر کاتب رہا۔ تاآنکہ ان کی خلافت ختم ہوگئی۔ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ عبدالحمید کتابت اور ہر علم و فن اور لٹریچر میں امام تھا۔ بعد میں آنیوالوں نے یہ چیزیں اس

سے لیں۔ اس کے طریقہ پر وہ چلے۔ اور اسی کے نقوش قدم کی پیروی کرتے رہے ..... یہ وہ پہلا شخص ہے جس کے مراسلات کو لمبا کیا۔ اور خطوط کے اول و آخر حمد و ثنا کو استعمال کیا۔ اور اس کے بعد اس طریقے سے لوگ بھی استعمال کرنے لگے۔[1] شریشی نے شرح مقامات میں لکھا ہے کہ عبدالحمید پہلا شخص تھا جس نے بلاغت کے غنچوں کو شگفتہ کیا اور بلاغت کے راستوں کو ہموار اور آسان کیا۔ اور شعر کی گردنوں کو حریت اور آزادی سے ہمکنار کیا۔

اس امر پر ہماری دلیل کہ عبدالحمید کا انداز مکاتبت ایرانی رجحانات کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ابن خلکان کا یہ بیان ہے کہ عبدالحمید آزاد کردہ غلاموں میں سے ہے۔ اور اس کی اصل انبار[2] سے تھی۔ ابن خلکان نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ عبدالحمید کاتب نے کتابت کا فن ہشام بن عبدالملک کے آزاد کردہ غلام سالم سے سیکھا تھا۔ اس سے بھی زیادہ صریح وہ بیان ہے جو ابوہلال عسکری نے اپنی کتاب "دیوان المعانی" میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ جو شخص بلاغت کا فن کسی ایک زبان میں سیکھ لیتا ہے اس کے بعد اسے کسی دوسری زبان کی طرف منتقل ہونا پڑے۔ تو اس کے لئے جیسا کہ پہلی زبان میں کلام کی صناعت ممکن تھی اس دوسری زبان میں بھی ممکن ہوتی ہے۔ چنانچہ عبدالحمید کاتب نے کتابت کے وہ نمونے جو اس نے فارسی زبان میں قائم کئے تھے۔ بعینہٖ عربی زبان میں بھی ان کو منتقل کر لیا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فارسی خطبات کے تراجم اور رسائل بعینہٖ عربی خطبات و رسائل کے نمونہ پر ہوتے تھے۔ ایرانیوں کے ہاں بھی ایسی امثال موجود ہیں جو مضمون اور صنعت کے اعتبار سے عربوں کے ضرب الامثال سے کامل مشابہت رکھتی ہیں[3]۔ اس کے بعد مصنف ممدوح نے فارسی کی کچھ ضرب الامثال بیان کی ہیں۔ اور ان کے بالمقابل عربی کی ضرب الامثال بیان کر کے دونوں میں موازنہ کیا ہے۔

یقیناً آپ مجھ سے اس بات میں اتفاق کریں گے کہ ایرانی لٹریچر نے عربی لٹریچر کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا تھا بلکہ شاید یہ زیادہ صحیح اور دقیق تعبیر ہوگی کہ دونوں لٹریچروں نے ایک دوسرے پر اپنا اپنا اثر مرتب کیا ہے۔

ان وجوہ کا یہ مختصر سا بیان ہے جن سے ایران نے عربوں کی ادبی زندگی کو متاثر کیا تھا۔ رہ گئے وہ اثرات جو علوم کی تدوین میں انھوں نے مرتب کئے اور علم کی مختلف فروع میں ایران نے جو بڑے بڑے علماء پیدا کئے۔ تو اس کا بیان ہم آئندہ کسی دوسرے موقعہ پر کریں گے۔

---

[1] ابن خلکان ص ۴۳۵

[2] عراق کے شمال مشرقی حصہ میں فرات کے بائیں کنارے پر انبار ایک شہر ہے۔

[3] دارالکتب کا ایک قلمی نسخہ۔

باب چہارم

یونانی اور رومی اثرات

فصل اول

نصرانیت

مسلمانوں نے مختلف شہروں کو فتح کیا جو مصر، بلاد مغرب، اندلس اور شام میں نصاریٰ سے بھرے ہوئے تھے۔ فتوحات اسلامی کے عہد میں نصرانیت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جن میں زیادہ مشہور تین فرقے تھے یَعَاقِبَۃ جو مصر، نوبہ اور حبشہ میں پھیلے ہوئے تھے نَسَاطِرَۃ (نسطوریہ) جو موصل، عراق اور ایران میں پھیلے ہوئے تھے مَلْکَانِیَۃ جو بلاد مغرب صقلیہ۔ اندلس اور شام میں پھیلے ہوئے تھے ــــ ان فرقوں میں باہم دینی عقائد کے بارے میں جنگ و جدال برپا رہتی تھی یعاقبہ کا عقیدہ تھا کہ مسیح خود خدا تھا۔ خدا اور انسان ایک طبیعت میں متحد ہو گئے تھے جس کا نام مسیح تھا۔ ملکانیہ اور نساطرہ کہتے تھے کہ مسیح میں دو طبیعتیں موجود تھیں جو ایک دوسری سے متمیز تھیں۔ ایک تو طبیعت لاہوتیہ تھی اور دوسری طبیعت ناسوتیہ تھی۔ ان کے علاوہ دیگر تفاصیل میں بھی دونوں فریقوں میں اختلافات تھے۔ یہ اختلاف ان میں بہرحال قائم رہا کہ ــــ کیا لاہوتیت اور ناسوتیت کا ارادہ اور فعل مسیح میں دونوں متحد تھے یا مختلف تھے؟ یعاقبہ اتحاد کے قائل تھے اور نساطرہ کہتے تھے کہ مسیح کی طبیعت ناسوتیہ کے لئے جو ارادہ اور فعل ثابت ہے وہ بالکلیہ اس کے عنصر لاہوتی کے ارادہ اور فعل سے مختلف ہے[1]۔ پھر اس میں بھی اختلاف تھا کہ ناسوت کے ساتھ لاہوت کے متحد ہونے کی صورت کیا ہے۔ یعاقبہ کہتے تھے کہ اس کی صورت ایسی ہے جیسے پانی کو شراب میں آمیز کر دیا جائے کہ دونوں مل کر ایک صورت بن جاتے ہیں۔ نسطوریہ کہتے تھے کہ نہیں بلکہ ایسی صورت ہے جیسے زیتون کے تیل میں پانی ملا دیا جائے کہ دونوں چیزیں مل جانے کے باوجود اپنی اپنی جگہ پر بھی الگ الگ قائم رہتی ہیں۔ ملکانیہ کہتے تھے کہ اس کی صورت ایسی ہے جیسے تلوار کے پھل کو آگ پر خوب تپا کر گرم کر لیا جائے تو وہ آگ کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے[2]۔

---

[1] یہ نسطور کے متبعین تھے جو اپنے زمانہ میں قسطنطنیہ کا بطریق تھا ۴۳۰ء کے لگ بھگ جلاوطنی میں اس نے انتقال کیا۔ شہرستانی کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ نسطوریہ مامون رشید کے عہد میں ظاہر ہوا تھا [2] ملاحظہ ہو BOER فلسفۂ اسلامیہ ص۱۲ [3] ابن حزم کی الملل والنحل ص۵۳

یہ سب کچھ ہم نے اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ امر واضح ہو جائے کہ نصرانیت جو مسلمانوں کے مفتوحہ شہروں میں پھیلی ہوئی تھی وہ خود کس قدر اختلاف آراء کا شکار تھی اور خود خدا کے بارے میں ان کے جو عقائد تھے ان میں بھی ان میں کس قدر کشمکش برپا تھی۔ خود قرآن کریم نے بھی ان فرقوں کے کچھ اقوال کو پیش کر کے ان کی تردید فرمائی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ

یقیناً وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے۔

ایسے ہی دوسری جگہ حضرت مسیحؑ کو خطاب فرماتے ہوئے کہا گیا ہے۔

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ ......

اے عیسیٰ! کیا لوگوں سے تو نے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے علاوہ اپنا معبود بنالینا عیسیٰ نے جواب دیا تیری ذات اس سے پاک ہے ....

نصاریٰ کے مابین یہ باہمی نزاع صرف اللہ سے متعلق عقیدہ میں ہی نہیں تھی بلکہ اور دوسرے بہت سے مسائل میں بھی اختلاف تھا۔ مسیح قیامت سے پہلے زمین پر نزول فرمائیں گے یا نہیں؟ حشر صرف ارواح کا ہوگا۔ یا ارواح اور ابدان دونوں کا ہوگا؟ اللہ کی صفات اس کی ذات سے زائد ہیں یا اس کا عین ہیں؟ نسطوریہ فرقہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو اچھی تقدیر اور بُری تقدیر کے قائل تھے۔ غرضیکہ ایسے بہت سے مسائل تھے جو غیر محسوس طور پر مسلمانوں میں سرایت کرتے چلے گئے۔ اور ان کے درمیان بھی ان مسائل و نزاعات کی وجہ سے جنگ و جدل شروع ہو گیا۔ اور نبی اکرم صلعم کا یہ ارشاد گرامی حرف بحرف سچ ہو کر رہا کہ

تم اپنے سے پچھلی امتوں کی پوری پوری پیروی کرو گے۔ اس طرح جیسے ایک تیر دوسرے تیر کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔

اس پیروی کے اثرات اسلامی فرقوں میں ہمیں واضح طور پر مل سکتے ہیں۔

باہمی مناظروں اور بحثوں کی مدد کے لئے نصرانیت کو یونانی فلسفہ کی ضرورت پڑی۔ تاکہ اولاً بت پرستوں کے مقابلہ میں اور پھر آخر میں مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ اپنی تعلیمات و عقائد کو دلائل عقلیہ سے ثابت کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر مذہبی پیشوا فلسفی ہوتے تھے۔ مثلاً پادری اوغسطینوس (FATHER AUGUSTINUS) ۳۵۴ تا ۴۳۰ء) فلسفہ کے ساتھ دین کے اس امتزاج کا جغرافیائی مرکز شہر اسکندریہ تھا۔ شہر اسکندریہ اس عہد سے پہلے بھی لائبریریوں کی کثرت۔ تنقید و تبصرہ کی متانت اور کشادگی فکر و نظر کے لئے قدیم عہد سے مشہور چلا آتا تھا۔ اب اس عہد میں وہ مذاہب فلسفہ اور فرقہائے مذہبیہ کا شہر بن گیا تھا۔ لہٰذا دینی آراء کا اتصال و امتزاج بہت ہی آسان ہو گیا تھا۔ نیل کے کناروں پر ایسے لوگ ملتے جلتے تھے جن

کی آراء مختلف اور مذاہب متخالف ہوتے تھے۔ ان میں آراء کے تبادلے بھی اسی طرح ہوتے تھے جیسے دیگر سامان ہائے تجارت کے تبادلے ہوتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ فکر کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ اور مختلف قسم کی آراء میں ایک مفاہمت اور مقارنت کی شکل پیدا ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایسی نئی روح کا ظہور ہوا جس کی بنیاد دو متناقض مبادی پر قائم تھی جو بعد میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل گئے۔ ان میں سے ایک مبدا شک اور تنقید کا تھا اور دوسرا مبدا سرعت تصدیق کا۔ اسکندریہ میں اہل مشرق اور اہل مغرب (یونان) کی آراء ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونان کی روح مشرقیوں کی روح کے ساتھ آمیز ہو گئی۔ چنانچہ نتیجے کے اعتبار سے ایسے عقائد اور ایسے دینی نظاموں نے جنم لیا جو اہل مغرب کے غور و فکر اور اہل مشرق کے الہام دونوں سے متاثر تھا۔ یونان کے پاس علم تھا اور مشرقی لوگوں کے پاس قصے کہانیاں تھیں۔ روح یونانی اپنے ساتھ ذکاوت، دقت نظر اور وضاحت کے ساتھ تشریح کی قدرت لائی جس میں مشرق کا جذباتی شعلۂ جوالہ شامل ہو گیا۔ جس نے اسے روشن تابناک اور زندہ کر دیا۔ اسی طرح مشرقی روح نے ـــــ جس کی خصوصیات میں ماورائے عالم شہادت کی طرف حرص ہے ـــــ ایک مرتب نظام اور پسندیدہ منظم نظریات پیش کئے۔ جو شاید یونانی علم کی مدد کے بغیر وہ پیش نہ کر سکتا۔ یونانی علم نے مشرق کی منقولات کو نظم و ترتیب سے آشنا کیا۔ اور ان کی زبانوں کی گرہ کو کھول دیا۔ چنانچہ بالآخر انھوں نے وہ دینی عقائد اور فلسفی نظم پیش کیا جو غنوسطیہ۔ افلاطونیۂ جدیدہ۔ یہودیت فیلون۔ اور بولیان صابی کے بنا کردہ مشرکانہ مذہب کی شکل میں اپنی انتہائی بلندی تک پہنچ گیا۔ مشرق کے امور غیب اور خوارق عادات کی طرف میلان اور تصوف اور دینداری کی طرف اس کے رجحان نے یونان کی باریک بینی اور گہری تحقیق و تفتیش کے ساتھ اختلاط و ارتباط پیدا کیا۔ اگر ہم چاہیں تو اسے بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ مشرق کا شعور اور یونان کی منطقی تحلیل باہم گرآمیز ہو گئے۔ اور ان دونوں کی آمیزش سے ایک خاص فکر پیدا ہوئی جو اسکندریہ میں ابتدائی مسیحی صدیوں میں پھیلتی چلی گئی۔ اور اس فکر نے بیک وقت دو رنگوں کو قبول کر لیا۔ ایک رنگ تو اہل کمال اور صوفیوں کا رنگ تھا۔ اور دوسرا رنگ علمی بحث و تحقیق کا رنگ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زمانہ اس امر میں ممتاز ہے کہ اس عہد میں فلسفہ کو دین کی طرف اور دین کو فلسفہ کی طرف خاصا میلان رہا ہے۔[1]

فصلِ دوم

فلسفۂ یونانیہ

ابتدائی مسیحی صدیوں میں اسکندریہ کے اندر وہ مذہب بہت پھیلا جو افلاطونیۂ جدیدہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مذہب

---

[1] مبادیٔ الفلسفہ جس کا ترجمہ عربی میں خود مصنف نے کیا ہے۔

نے مسلمان فلاسفہ اور علمائے کلام اور خصوصیت کے ساتھ معتزلہ اور صوفیا پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔

اس مذہب کا بانی اَمینوسؔ سکاسؔ تھا جو ابتداءً محض ایک قلی اور مزدور تھا۔ اس کے بعد وہ اسکندریہ میں فلسفہ کا معلّم بن گیا۔ اس کے ماں باپ دونوں نصرانی تھے۔ لیکن وہ اپنے قدیم یونانی دین کی طرف لوٹ گیا۔ یہ اسکندریہ کے ان پہلے معلمین میں سے ہے جنہوں نے افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات میں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ اس کی کوئی کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ لہٰذا اس کی تعلیمات سے متعلق ہماری معلومات بہت ہی کم ہیں۔ اس کا انتقال ۲۴۲ء میں ہوا۔ اس کا شاگرد "افلوطین" اس مذہب کو منظم کرنے والا اور اس کا بہت بڑا مؤید اور اس کی طرف سے بڑا مدافعت کرنے والا شمار ہوتا ہے بلکہ بعض لوگ تو اسے ہی اس مذہب کا بانی شمار کرتے ہیں۔ اس کی پیدائش لیکوپولیس (LICOPOLIS) ـــــ اسیوط۔ میں ۲۰۵ء میں ہوئی۔ اس نے اسکندریہ میں تعلیم پائی اور امینوس کے ساتھ تقریباً گیارہ سال تک رہا۔ یہ ایک حملہ آور فوج کے ساتھ مل گیا جو ایران پر حملہ کرنے جارہی تھی۔ تاکہ ایران اور ہندوستان کے علوم حاصل کر سکے ۲۴۵ء میں وہ روما چلا گیا۔ اور وہیں اس نے فلسفہ کا ایک مدرسہ قائم کیا اور ۲۷۰ء میں انتقال کر گیا۔ عربوں کو اس افلوطین کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ البتہ وہ اس کے اسکول کو جانتے تھے۔ اور اسکندرانیوں کا مسلک کہا کرتے تھے۔ شہرستانی نے اسے شیخ یونانی کے نام سے پکارا ہے۔ اس کے بہت سے فلسفی نظریات عربوں تک غلطی سے دوسروں کی طرف منسوب ہو کر پہنچے ہیں۔ افلوطین نے بہت سی کتابیں لکھیں جو آج تک محفوظ ہیں۔ ان کو (تاسوعات) اینیڈ (ENNEADS) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے مذہب کی بعد میں بہت سی شاخیں ہو گئیں۔ ایک شاخ اسکندریہ میں تھی۔ دوسری شاخ شام میں تھی اور تیسری شاخ اَتھینا میں تھی۔ اس کی کچھ آرا تو وہ ہیں جو طبیعیات سے متعلق ہیں۔ جن کی اس وقت ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ الٰہیات کے بارے میں بھی اس کی کچھ آرا ہیں۔ جن میں سے کچھ ہم آئندہ بیان کریں گے۔

افلوطین کہتا ہے کہ اس دنیا کے ظواہر بے شمار ہیں جو ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ یہ از خود موجود نہیں ہوگئی۔ بلکہ اس کے موجود ہونے کیلئے ایک سابقہ علت ضروری تھی جو اس کے وجود کا سبب بنی۔ یہ علت جس سے یہ دنیا صادر ہوئی ہے۔ ایک ہے متعدد نہیں۔ عقول اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ اور افکار اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتیں۔ کوئی چیز اسے محیط نہیں ہو سکتی۔ وہ ازلی ہے۔ ابدی ہے اور قائم بالذات ہے۔ وہ مادہ، روح اور عالم روحانی سے ماورا ہے۔ اس نے تمام مخلوق کو پیدا کیا اور مخلوقات میں حلول نہیں کیا بلکہ وہ قائم بالذات ہے اور اپنی مخلوق پر غالب اور مسلط ہے۔ نہ وہ ذات ہے۔ نہ وہ صفت ہے بلکہ وہ ارادۂ مطلقہ ہے۔ کوئی چیز اس کے ارادہ سے خارج نہیں۔ وہ علت العلل ہے اور اس کی کوئی علت نہیں ہے وہ ہر مکان میں ہے اور اس کا کوئی مکان نہیں ہے۔

یہ دنیا اس سے کیونکر پیدا ہو گئی؟ یہ دنیا جو مرکب ہے اور ہر آن متغیر ہے۔ ایک بسیط سے جسے کوئی تغیر لاحق نہیں ہو سکتا کیسے صادر ہو گئی؟ یہ دنیا موجود نہیں تھی پھر موجود ہو گئی۔ کیا خالق سے کسی ایسی چیز کا صدور اس طرح ممکن ہے کہ اس کی ذات میں

اس کی وجہ سے کوئی تغیر رونما ہو؟ یہ فانی دنیا اللہ سے جو غیر فانی ہے کیونکر صادر ہو سکتی تھی؟ یہ دنیا صانع دنیا سے سوچ سمجھ کر صادر ہوئی یا بلا سوچے سمجھے صادر ہوگئی؟ دنیا میں شر کا وجود کیوں ہے؟ روح کیا ہے؟ بدن میں حلول کرنے سے پہلے یہ کہاں تھی اور بدن سے جدا ہونے کے بعد یہ کہاں جائے گی؟

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اہم مسائل تھے جن میں افلوطین اور اس کا اسکول مشغول رہتا تھا۔ ان مسائل پر بہت بحث مباحثے ہوئے اور لوگ مختلف خیالات کی طرف گئے۔ جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ہم نے ان مسائل کی طرف محض یہ بتلانے کے لئے اشارہ کیا ہے کہ معلوم ہو سکے کہ اس وقت کی علمی دنیا کن مسائل کی تحقیق میں لگی ہوئی تھی۔ تاکہ اس کے بعد ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ اس نے ہم پر کیا اثرات مرتب کئے۔

اسکندریہ کا یہ مذہب ابتداءً خالص عقلی بحث و فکر کی طرف میلان رکھتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس نے یونانی اصنامیات کی تائید اور نصرانیت کی مخالفت شروع کر دی۔ اس کے بعد شدہ شدہ یہ اس پستی تک جا پہنچا، جہاں پہنچ کر وہ محض غیب کی باتوں کی اطلاع، خوارقِ عادات، سحر اور جادو کی طرف توجہ، اسما، اور طلسمات کے ذریعہ سے تصرفات، کہانت، نجوم، دعاؤں اور اوراد وغیرہ پر قناعت کرنے لگ گیا۔

جب نصرانیت کو فتح ہوئی اور "جوستنیان" آیا تو اس نے "اثینا" میں فلسفہ کے تمام اسکول بند کرا دیئے اور فلاسفہ کی پکڑ دھکڑ شروع کی۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ بھاگ گئے۔ (ان بھاگنے والوں میں وہ سات فلاسفہ بھی تھے جو ایران چلے گئے تھے اور جن کا کسریٰ انوشیرواں نے شایانِ شان استقبال کیا اور انھیں عزت کے ساتھ اپنے ہاں مہمان رکھا تھا۔ اور جوستنیان کے ساتھ جب انوشیرواں کی صلح ہوئی تو اس نے شرائط صلح میں یہ شرط بھی داخل کی کہ ان فلاسفہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے ـــ یہ ساتوں فلاسفہ افلاطونیہ جدیدہ کے علمبردار تھے) اور کچھ نصرانی ہو گئے۔ جو لوگ نصرانی ہو گئے تھے انھوں نے افلاطونیہ جدیدہ کے فلسفہ کو نصرانیت کے رنگ میں رنگ کر پیش کیا۔ مثال کے طور پر دیونیسوس کی کتاب پیش کی جا سکتی ہے جسے کسی نامعلوم افلاطونی نے ـــ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں ـــ دیونیسوس کے نام سے تصنیف کیا۔ اس کتاب میں اس نے دعوےٰ کیا ہے کہ وہ پولوس حواری کے شاگردوں میں سے ہے۔ اس کتاب میں اس نے ربوبیت کے اسرار و رموز کی شرح کی ہے اور مذہب افلاطینی کے مطابق عالم ملکوت کے درجات اور آسمانی کنیسہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ یہ کتاب اس وقت سے نصاریٰ میں بڑی معتمد تسلیم کی جاتی ہے[1]۔ پھر یہ مذہب معتزلہ، حکماء اور صوفیہ کے ایک طبقہ کے ہاتھوں اسلام میں داخل ہوا۔ چنانچہ جماعت "اخوان الصفا" نے اپنی زیادہ تر افکار انہی لوگوں سے لی تھیں۔

---

[1] برلن میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام "اثولوجیا ارسطاطالیس" ہے کتاب سنہ ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی ہے اور الٰہیات کے موضوع پر ہے یہ فرفوریس صوری کی تفسیر ہے جس کو عبدالمسیح حمصی بن ناعمی نے عربی میں ترجمہ کیا۔ اور یعقوب کندی نے اس کی درستگی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ارسطو کے مذہب پر نہیں بلکہ افلوطین کی مذہب پر ہے۔ یہ فرفوریس افلوطین ہی کا شاگرد تھا جس کی وفات سنہ ۳۰۴ء میں ہوئی تھی اور اس نے یہ کتاب افلوطین کے مذہب پر ہی لکھی تھی۔

سُریانیون یونانی فلسفہ کو عراق اور اس کے نواحی میں اور خصوصیت کے ساتھ افلاطونیت جدیدہ کو ـــ سریانیوں نے پھیلایا۔ ان لوگوں نے یونانی کتابوں کا اپنی سریانی زبان میں ترجمہ کیا ـــ سریانی زبان آرامی زبانوں میں سے ایک زبان ہے ـــ یہ فلسفہ دجلہ اور فرات کے درمیانی دوآبہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں پھیل گیا تھا۔ ان کا سب سے بڑا مرکز رہا (EDESSA) اور نصیبین تھا۔ اس کے علاوہ انطاکیہ اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں بسنے والے نصرانی مصنفین کے لئے اس زمانے میں علم و ادب کی ایک یہی زبان (سُریانی زبان) تھی۔ نیز ان نصاریٰ کی علمی زبان بھی سریانی زبان ہی تھی جو حکومت ایران کے ماتحت زندگی بسر کرتے تھے۔ ان علاقوں میں بہت سے دینی مدارس تھے جن میں سریانی اور یونانی دونوں زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ رُہا۔ نصیبین اور جندیسابور کے مدرسے کافی مشہور تھے۔

سریانی زبان بت پرستی اور اس کے آداب کی زبان بھی تھی۔ سریانی اصنامیات کا مشہور ترین مرکز شہر حرّان تھا۔ جو رُہا کے جنوب میں واقع تھا۔ یہ شہر اسلام کے بعد تک بھی دین بت پرستی اور تہذیب و ثقافت یونانی کا عرصہ تک مرکز بنا رہا ہے۔ یہ لوگ فتح اسلامی کے بعد بھی۔ ریاضت۔ فلکیات اور مذہب افلاطونی کے مطابق فلسفہ کی تعلیم و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو ـــ اس کے بعد ـــ مامون کے عہد اور اس کے بعد کے زمانہ میں صابئین کے نام سے پکارے گئے۔ ان میں سے بہت سے بلند پایہ مصنف گذرے ہیں اور وہ لوگ بھی گذرے ہیں۔ جنہوں نے آگے چل کر غیر زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرنے کی ذمہ داری سنبھالی۔

سریانی ادبیات تیسری صدی مسیحی سے چودھویں صدی تک زندہ رہیں۔ لیکن فتوحات اسلامی کے بعد ان کی زندگی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ کیونکہ عربی زبان نے سریانی زبان پر حملہ کر کے اسے مغلوب کر لیا تھا۔

سریانی ادب میں سے مختلف انواع سے متعلق ایک مجموعہ ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن ان میں سے جو باقی بچا ہے وہ نصرانی اسکول سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ کہ اصنامیاتی اسکول سے۔ چنانچہ نمازوں۔ دینی دعاؤں۔ تاریخی قصوں۔ تاریخ عام۔ فلسفہ اور دیگر علوم پر کچھ سریانی کتابیں ملتی ہیں ـــ مگر سب کی سب دینی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں ـــ کیونکہ ان کے زیادہ تر مصنفین قسیس اور راہب ہوتے تھے۔ نظمی اور نثری لٹریچر کے آثار بہت کم ملتے ہیں۔

سُریانیوں نے علم اور فلسفہ کی خدمت تصنیف کے بالمقابل ترجمہ کی صورت میں زیادہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً ندرت فکر (ORIGINATE) کا ثبوت ان کے ہاں نہیں ملتا۔

سریانی زبان نے بعض ان یونانی کتابوں کو بھی محفوظ کر لیا۔ جن کی اصلیں گم ہو چکی تھیں۔ یونانی فلسفہ کی کتابوں کے ان کے کئے ہوئے وہ ترجمے ہی تھے۔ جن پر عربوں اور مسلمانوں نے ابتداءً اعتماد کیا تھا۔ ابتدائی زمانہ میں سُریانی ترجمہ تقریباً لفظی ترجمہ ہوا کرتا تھا کچھ عرصہ کے بعد متاخرین نے لفظی ترجمہ سے احتراز کیا اور بامحاورہ اور آزاد ترجمہ شروع کر دیا۔

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
Hashmi
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم ونازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور
جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے
چھوٹا مسواک ہر چھوٹی اور بڑی دکان پر ملتا ہے

کیا آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

جشن نامے
ایسے عنوانات جنھیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

مزاج شناس رسول
یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول — مزاج شناس رسول کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ قیمت چار روپے

مقام حدیث
حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جوابات۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے

قرآنی دستور پاکستان (از پرویز)
اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام
اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات کا مجموعہ جنھوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

نوادرات از:- علامہ اسلم جیراجپوری
علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ
بڑا سائز ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از:- پرویز
مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات، انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ قیمت دو روپے

قرآنی فیصلے
روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآنی روشنی میں بحث
۴۰۸ صفحات قیمت چار روپے

اقبال اور قرآن از:- پرویز
علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے

اسباب زوال امت از:- پرویز
مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا (دوسرا ایڈیشن) ۱۷۲ صفحات قیمت دو روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار رہیگا)

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۳/۱۵۹۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹